سہ ماہی مجلہ بحث ونظر حیدرآباد

شمارہ نمبر : ۱۰۹-۱۱۰ / ۹-۱۰	جولائی — دسمبر ۲۰۱۷ء	شوال ۱۴۳۸ھ — ربیع الاول ۱۴۳۹ھ

زرِتعاون

اندرون ملک	بیرونِ ملک
ایک شمارہ:40روپے	ایشیائی ممالک کیلئے سالانہ:20امریکی ڈالر
سالانہ:150،بذریعہ رجسٹری:200	یورپ،امریکہ،افریقہ کے لئے :
سہ سالہ:450،بذریعہ رجسٹری:550	سالانہ:30امریکی ڈالر

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

Khalid Saifullah Rahmani, Baitul Hamd, H.No:16-182/1, Quba Colony, Po:Pahadi Shareef, Hyd. A.P 500005, Ph: 9989709240 E-mail: ksrahmani@yahoo.com

چیک/ ڈرافٹ پر صرف:"Khalid Saifullah" لکھیں

کمپیوٹر کتابت: محمد نصیر عالم سبیلی ''العالم'' اُردو کمپیوٹرس، حیدرآباد، فون نمبر:9959897621 91+

فہرست مضامین

● ● ●

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ

سہ ماہی ''مجلہ بحث ونظر'' کا مشترکہ شمارہ جولائی — دسمبر ۲۰۱۷ء قارئین کی خدمت میں پیش ہے، اس شمارہ میں اہم فقہی مضامین کے ساتھ ساتھ بعض اُصولی مباحث اور متعدد اہم شخصیات کا تذکرہ بھی شامل ہے، اس طرح آپ کا یہ مجلہ مقررہ نظام پر آپہنچا ہے، کوشش ہے کہ آئندہ شمارہ سے یہ وقت پر شائع ہو اور تاخیر سے دوچار نہ ہو، اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں ہماری مدد فرمائیں، قارئین سے بھی اس کے لئے دُعاء کی درخواست ہے۔

حالیہ عرصہ میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر دو اہم مسائل پیش آئے، ایک مسئلہ خود ہمارے ملک سے متعلق ہے، سنگھ پریوار کے زیر اثر میڈیا نے مسلمانوں کے حقیقی مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے طلاق اور تین طلاق کے مسئلہ کو کچھ اس طرح اُٹھایا، گویا اس وقت یہی مسلمانوں کا بلکہ ملک وقوم کا سب سے بڑا مسئلہ ہے؛ حالاں کہ مسلمانوں میں طلاق کے واقعات بہ مقابلہ دوسرے لوگوں کے کافی کم ہیں، اور پھر طلاق کے جو کچھ واقعات ہیں، ان میں بھی تین طلاق کے واقعات تو بہت ہی کم ہیں؛ لیکن حقیقی مسائل سے توجہ ہٹانے کے لئے اس مسئلہ کو خوب نمایاں کیا گیا، یہاں تک کہ یہ مسئلہ سپریم کورٹ پہنچا اور سپریم کورٹ نے ایسا فیصلہ کیا جس میں تضادات بھی ہیں اور اس کا مقصد بھی غیر واضح ہے۔

اس فیصلہ نے حقیقت یہ ہے کہ مسلم خواتین کے لئے بڑی دشواریاں پیدا کردی ہیں، کورٹ نے تین طلاق کو سرے سے غیر معتبر قرار دے دیا ہے، یعنی اس سے نہ ایک طلاق واقع ہوگی اور نہ تین، ظاہر ہے کہ یہ مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر کے نقطۂ نظر کے خلاف ہے، اب صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ اگر کسی شخص نے تین طلاق دے دی تو مسلم سماج تو اسے تین طلاق ہی شمار کرے گا، کورٹ ایک حکم دے سکتا ہے؛ لیکن لوگوں کے یقین کو نہیں بدل سکتا، اس طرح ایک طرف وہ آپس میں میاں بیوی کے تعلقات نہیں رکھ سکیں گے اور دوسری طرف قانون اسے دوسرے نکاح کی اجازت نہیں دے گا تو آخر وہ غریب عورت کیا کرے؟

شریعت میں مداخلت کی اس صورتِ حال کا علاج دو ہی ہے، ایک یہ کہ دار القضاء کے نظام کو زیادہ سے زیادہ تقویت پہنچائی جائے اور مسلمان اپنے مسائل کو سرکاری عدالتوں میں لے جانے سے گریز کریں، دوسرے:

معاشرہ کی اصلاح ہواور تین طلاق کے واقعات کا سد باب کیا جائے، اس کا ماحول بنانے کے لئے علماءکو ایک مہم کے طور پر اس کام کو کرنا ہوگا، جہاں عبادات اور بعض دیگر مسائل میں مسلمان اپنی مرضی سے دین پر عمل کرتے ہیں، اسی طرح نکاح وطلاق کے معاملات میں بھی اپنی مرضی سے اپنے آپ کو شریعت پر قائم رکھیں، جب تک مسلمان خود اپنی شریعت کو اپنے آپ پر نافذ کرنے کے لئے تیار نہ ہوں، ان کو حکومت اور عدالت سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ ان کی شریعت کی حفاظت کریں گے۔

ایک اہم بین الاقوامی مسئلہ، جو ادھر چند ماہ کے درمیان پیش آیا ہے، روہنگیا مسلمانوں کا ہے، یوں تو اس وقت پوری دنیا میں خونِ مسلم کی ارزانی کا سلسلہ جاری ہے؛ لیکن اس وقت اراکان میں جس طور پر مسلمانوں کی خونریزی جاری ہے، وہ حیوانیت اور درندگی کی تمام حدوں کو پار کر چکی ہے، معصوم اور ضعیف بوڑھے لوگوں کا قتل، عورتوں کی اجتماعی عصمت ریزی، گھروں کو نذر آتش کرنا، پوری پوری آبادی کو راکھ کے ڈھیر میں بدل دینا، قتل کے لئے نہایت تکلیف دہ طریقہ اختیار کرنا، مسجدوں اور مدرسوں کو زمیں بوس کر دینا اور مسلمانوں کی ثقافت کے ایک ایک نشان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا، غرض کہ ایسے مظالم جو اسپین پر عیسائیوں قبضہ کے وقت عقوبت خانوں میں ڈھائے گئے تھے کے سوا شاید ہی تاریخ میں اس کی کوئی مثال مل سکے۔

یہ بات نہایت ہی شرمناک ہے کہ جو ممالک بزعم خود انسانیت کے علمبردار بنے ہوئے ہیں اور وہ عالمی پولیس کی طرح پوری دنیا میں کام کر رہے ہیں، اس المناک واقعہ پر سوائے زبانی جمع خرچ کے ان کی طرف سے کوئی عملی اقدام سامنے نہیں آیا، سب سے افسوس ناک رویہ مسلم ممالک کا ہے، بنگلہ دیش نے ڈھیر سارے برمی مہاجرین کو نہ صرف واپس بھیج دیا؛ بلکہ ایسی شقاوت قلبی کا مظاہرہ کیا کہ مہاجرین کی کشتیوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور سینکڑوں مسلمان غرقاب ہو گئے، ملیشیا، انڈونیشا اور برونائی ایسے ممالک ہیں جو سمندر کے واسطے سے برما سے ملتے ہیں، یہ ممالک ان مظلوموں کی مدد کر سکتے تھے؛ لیکن انھوں نے کوئی قابل ذکر مدد نہیں کی اور بہت سی کشتیوں کو اپنی بندرگاہ پر اُترنے سے روک دیا، افسوس کہ ہجرت کی سنت ادا کرنے پر مسلمان مجبور ہیں؛ لیکن نصرت کی سنت ادا کرنے والے انصار موجود نہیں رہے، اس کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کے خون کا کوئی حساب لینے والا نہیں ہے، بارِ الٰہا! مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ اس اُمت کو واپس عطا فرما دیجئے اور اِس رسوائی اور تنہائی سے بچا لیجئے۔ آمین

خالد سیف اللہ رحمانی	۱۲/صفر ۱۴۳۹ھ
(بیت الحمد، شاہین نگر، حیدر آباد)	۲/نومبر ۲۰۱۷ء

مناجات بہ دربارِ الٰہی

نتیجۂ فکر: خالد سیف اللہ رحمانی

تیرے دربار میں آیا ہوں ، خالی ہاتھ آیا ہوں
گناہوں کا یہ بارِ بے کراں بھی ساتھ لایا ہوں
نہیں حُسنِ عمل کی کوئی دولت ساتھ ہے میرے نہیں فکر ونظر کی کوئی شوکت ساتھ ہے میرے
نہ ہی آقا! دلِ روشن کی ثروت ساتھ ہے میرے نہ کوئی اور وجہِ عفو و رحمت ساتھ ہے میرے
مگر تیرا ہی بندہ ہوں ، اسی نسبت سے آیا ہوں
تیرے دربار میں آیا ہوں ، خالی ہاتھ آیا ہوں
بہت رسوا ہوا ہوں ، لمحہ لمحہ چوٹ کھائی ہے خود اپنے ہی لہو سے بزم مئے میں نے سجائی ہے
ہمارے خوں سے سب نے تشنگی اپنی بجھائی ہے تیرے دربار میں فریاد ہے ، اپنی دہائی ہے
یہی کچھ داستانِ دردِ دل میں ساتھ لایا ہوں
تیرے دربار میں آیا ہوں ، خالی ہاتھ آیا ہوں
قسم ہے تیری عظمت کی ، قسم ہے تیری رحمت کی نگاہِ لطف کی ، نظرِ کرم ، عفو وعنایت کی
تیرے جود وسخا کی ، درگذر ، شانِ جلالت کی تم ہی منزل ہو میری چاہ کی ، میری محبت کی
اِسے بھردے ، تیرے دربار میں کشکول لایا ہوں
تیرے دربار میں آیا ہوں ، خالی ہاتھ آیا ہوں
عبادت جذبۂ عشق و جنوں سے ، سوز سے خالی دُعاء و التجا ہے پر ، پرِ پرواز سے خالی
جو دل سے دل تلک جائے ، سخن اس ساز سے خالی محبت کی صدا سے ، عشق کی آواز سے خالی
بہت شرمندگی کے ساتھ تیرے پاس آیا ہوں
تیرے دربار میں آیا ہوں ، خالی ہاتھ آیا ہوں

تیری چوکھٹ پہ ہر دم خم رہے، وہ سر مجھے دے دے — تیری چاہت میں جو بے تاب ہو، وہ چشم تر دے دے
سفینہ پار لے جائے، وہ مردِ دیدہ وَر دے دے — جو میری آہ پہنچا دے، مجھے وہ نامہ بر دے دے

ہوں محرومِ عمل ، پَر یہ تمنا ساتھ لایا ہوں
تیرے دربار میں آیا ہوں ، خالی ہاتھ آیا ہوں

ہدایت عام ہو ، یہ التجا ہے مالک کل سے — صدا وحدت کی آئے، ہر نفَس سے، صاحبِ دل سے
شجر سے، خار سے، ہر برگِ گل سے اور ہر گُل سے — زمین ہند کے ہر فرد سے ، ہر ذرۂ گل سے

کرم کا ملتجیٰ ہوں ، کچھ نہ اپنے ساتھ لایا ہوں
تیرے دربار میں آیا ہوں ، خالی ہاتھ آیا ہوں

(۲۰/ذوالحجہ ۱۴۳۸ھ، نزیل: مکہ مکرمہ)

● ● ●

بارگاہِ نبوی ﷺ میں!

نتیجۂ فکر: خالد سیف اللہ رحمانی

سلام شوق تجھ پر مہبط انوار ربانی
سلام شوق تجھ پر منبع فیضانِ عرفانی

تو قصرِ انبیاء میں لگنے والی خشتِ آخر ہے
نہیں شبہ کہ اس گیتی کا ہے تو درِ لاثانی

گناہوں سے نہ جانے کب کی دنیا مٹ گئی ہوتی
تیری ہی ضوء سے اس ظلمت کدہ میں آئی تابانی

بیاباں کی شبِ تاریک تھی بے کوکب و انجم
تیری ہی ضوء سے اس ظلمت کدہ میں آئی تابانی

تمدن لٹ چکا تھا علم سے بے بہرہ تھی دنیا
تیری تعلیم سے سیکھی گئی کارِ جہاں بانی

جو خود بے راہ تھے، رہرو بنے، پھر راہبر بن گئے
تیرے نقشِ قدم سے پھوٹتا تھا نورِ عرفانی

جہاں میں ہر طرف بے آبرو تھی دختر حوا
عطاء تونے کیا ان کو وقارِ نوعِ انسانی

غلاموں کی نہ تھی قیمت کوئی اس عالم گل میں
تیرے فیضِ نظر سے ہوگئے وہ رشکِ سلطانی

جبیں انسان کی ہوتی تھی خم ، ہر چیز کے آگے
سنایا تونے ہر سو نغمۂ توحید ربانی

میرے آقا ! یہ میرا غم بھی تیرے پیش خدمت ہے
تیری اُمت کے خوں کی ہر طرف ہے خوب ارزانی

ہو قدس و شام ، یا عراق ہو ، یا مصر و برما ہو
مسلماں کے لہو کی ہر جگہ جاری ہے بارانی

کیا جائے گا تیرا ذکر ہر دم ، ہر جگہ ، ہر سو
رہے گی جب تلک قائم یہ بزم کونِ امکانی

چُھٹا جو تیرا دامن ، ہم ہوئے ہر چار سُو رُسوا
ہماری وائے محرومی ، ہماری وائے نادانی

بڑا ناکارہ ، نالائق ، بڑا مجرم ہوں اے مولیٰ !
عمل سے ہوں تہی دامن ، گناہوں کی فراوانی

سفینہ ڈوبنے کوہے ، نہیں ہے ناخدا کوئی
سہارا ہے شفاعت ہی تیری ، درپیشِ ربانی

سلام بے نہایت تا ابد ہو ذاتِ عالی پر
نہیں ہو انتہا اس کی ، نہ اول ہو نہ ہو ثانی

نہیں کرسکتی خیرہ ، شوکتِ کسریٰ مجھے خالدؔ !
غلامی آپ کی بڑھ کر ہے از تاجِ سلیمانی

●

(۲۷رذی الحجہ ۱۴۳۸ھ،نزیل:مسجد نبوی ﷺ، مدینہ منورہ)

● ● ●

آسان تفسیر قرآن مجید

(مفسر: حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)

مولانا احمد نور قاسمی ☆

قرآن کا سمجھنا عربوں کے لئے جتنا ضروری ہے عجمیوں کے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں علماء اُمت نے قرآن کریم کا عجم کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنے اوراس کی آیتوں کی تفسیر کرنے کی کوشش کی ہے اور تا حال کررہے ہیں؛ تاکہ عجم کے باشندے قرآن کریم کے معانی ومفاہیم بخوبی سمجھ کراس کے مطابق زندگی گزارسکیں۔

عجم کی جن زبانوں میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا گیا ہے، ان میں اُردو زبان کا دامن کافی گہربار وگراں بار ہے، اُردو میں موجود قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر کی فہرست کافی دراز ہے، ان تراجم وتفاسیر کی تالیف مختلف مقاصد کے پیش نظر مختلف مناہج پر انجام دی گئی ہے اور ہر زمانے کے مزاج و مذاق کے مطابق علماء نے قرآنی پیغام کو اُردو قالب میں ڈھالنے کی سعی مشکور کی ہے اور تا حال کررہے ہیں۔

عصر حاضر میں کی جانے والی تفاسیر قرآن میں ایک اہم تفسیر حضرت الاستاذ فقیہ العصر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی کے قلم گہربار سے منظر عام پر آئی ہے، اس تفسیر کی اہمیت وافادیت کے لئے مولانا کا نام ہی کافی ہے، حضرت الاستاذ مولانا رحمانی ان معدودے چند نابغۂ روزگار شخصیات میں سے ایک ہیں، جن کے شب وروز تحقیق وتصنیف میں گذرتے ہیں، جن کے سفر وحضر علم کی اشاعت اور عمل کی دعوت کے لئے وقف ہیں، بندگانِ خدا کے دلوں میں ان کی محبت نقش ثبت ہے، مولانا کا قلم اعتدال ومیانہ روی، تحقیق وجستجو، تلاش حق، داعیانہ اُسلوب، حکیمانہ انداز بیان، بصیرت مندانہ نکتہ سنجی اور دلائل سے اعتنا جیسی خوبیوں سے مالا مال ہے، مولانا کو مبدأ فیاض سے جو دماغ ملا ہے، زمانہ شناس، عاقبت اندیش، دُوررس، باریک بیں اوراخاذ ہے اور جو دل ملا ہے اس میں داعیانہ تڑپ،

☆ استاذ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

انسانیت کے لئے پیار ومحبت، انسانی سماج کی اصلاح کے لئے بے چینی اور اتحادِ اُمت کے لئے بے قراری پائی جاتی ہے، آپ کا ایک خصوصی وصف یہ ہے کہ آپ کی محبت وشفقت کے دروازے رنگ ونسل اور مذہب ووطن سے ماورا ہوکر پوری انسانیت کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔

زیرتبصرہ ترجمہ اور اس کا مختصر تفسیری حاشیہ مولانا کی اسی علمی وتحقیقی نظر اور فقہی بصیرت کا آئینہ دار ہے، اس ترجمہ میں عربی قواعد کی کماحقہ پیروی کی گئی ہے، عربی زبان وادب کی پوری رعایت برتی گئی ہے، عربی تعبیرات کے مزاج کو بھی سامنے رکھا گیا ہے، اُردو جملوں کی ساخت میں اُردو کی فصاحت وبلاغت کو مکمل طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے، اُردو تعبیرات ومحاورات کو نہایت ہی خوش اُسلوبی سے استعمال کیا گیا ہے، عصمتِ انبیا کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، ترجمہ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ قرآنی آیات کے الفاظ ومعانی پر وارد ہونے والے اعتراضات ترجمہ سے ہی رفع ہوجائیں، لفظی ترجمہ کے بجائے بامحاورہ ترجمہ کیا گیا ہے؛ تاکہ آیت کو سمجھنے میں پیچیدگی اور دشواری نہ ہو۔

ترجمہ کے ذیل میں تفسیری حاشیہ ہے، جو مختصر لیکن نہایت ہی جامع ہے، اس میں جو بات بھی لکھی گئی ہے پوری تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے، از اول تا آخر مصادر اصلیہ سے مراجعت کا التزام کیا گیا ہے، مستند ومتداول عربی واُردو تفاسیر سے استفادہ کیا گیا ہے، دعوتی پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، فقہی مسائل مستنبط کئے گئے ہیں، اعداءِ اسلام ومستشرقین کا تشفی بخش اور مناسب پیرایۂ اظہار میں جواب دیا گیا ہے، غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، قرآن کریم کے اعجازی پہلوؤں کو اور خاص کر سائنسی اعجاز کو واضح کیا گیا ہے، سماجی مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے، مختلف گوشۂ حیات کے لئے رہنمایانہ اُصول بتائے گئے ہیں، گذشتہ اُمتوں کے واقعات سے ملنے والے سبق پر روشنی ڈالی گئی ہے، فکری وفقہی مباحث میں اعتدال ومیانہ روی کو ملحوظ رکھا گیا ہے، لہجہ نرم اور طرزِ بیاں شگفتہ وشیریں ہے، مشکل اور پیچیدہ مباحث بھی عام فہم اُسلوب میں سمجھائے گئے ہیں۔

مولانا کا یہ آسان ترجمہ قرآن مجید اپنی ان ہی خصوصیات کی بنا پر حلقۂ اربابِ ذوق میں شوق کے ہاتھوں لیا گیا اور سرمۂ نگاہ بنایا گیا ہے اور توقع سے بھی کم مدت میں اسے جو پذیرائی حاصل ہوئی ہے، وہ اس کے عنداللہ مقبول ہونے کی علامت ہے، اکابر علماء نے اس ترجمہ وتفسیر کے بارے میں جن گرانقدر تاثرات کا اظہار کیا ہے، ان سے بھی اس کی قدر ومنزلت اور اہمیت وافادیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، میں نے ''آسان تفسیر'' کے اس چمن گلہائے رنگ رنگ سے خصوصیتوں کے چند پھول چنے ہیں اور وہ قارئین کی خدمت میں پیش ہیں :

ترجمہ کی خصوصیات

(۱) سلاست وروانی : اُردو زبان میں ترجمۂ قرآن مجید کی ایک بڑی تعداد موجود ہے؛ لیکن سلاست

وروانی معدودے چند ہی کے حصہ میں آئی ہے، زیرتبصرہ ترجمہ قرآن مجید کے سلیس وروان ترجمہ کا سب سے اعلیٰ نمونہ نہیں تو چند اعلیٰ نمونوں میں سے ایک ضرور ہے، عربی سے واقف اُردوداں طبقہ بخوبی جانتا ہے کہ عربی عبارتوں کا رواں اُردو ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، یا تو روانی مفقود ہوجاتی ہے یا روانی کی وجہ سے معانی میں خلل آجاتا ہے؛ لیکن مولانا نے آیاتِ قرآنی کا ترجمہ اس خوش اُسلوبی سے کیا ہے کہ نہ روانی پر اثر پڑتا ہے اور نہ معانی میں خلل آتا ہے، مثلاً سورہ آل عمران کی آیت نمبر: ۱۵۳ کا ترجمہ ہے :

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَ لَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْۤ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا مَاۤ اَصَابَكُمْ ۔ (آل عمران: ۱۵۳)

(اے مسلمانو! وہ وقت یاد کرو) جب تم چڑھے چلے جارہے تھے، کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے اور رسول تم کو پچھلی صف سے پکار رہے تھے؛ چنانچہ اللہ نے تم کو اس رنج کے بدلہ رنج سے دوچار کیا؛ تاکہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور جو مصیبت تم کو پہنچے، اس سے تم رنجیدہ خاطر نہ ہوا کرو۔

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۔ (آل عمران: ۱۱۲)

نیز ان کی نافرمانیوں اور مسلسل زیادتیوں کا نتیجہ ہے۔

(۲) اُردو زبان کی چاشنی : الفاظ قرآن کا ترجمہ کرتے ہوئے بیشتر لوگ عربی جملوں کی ساخت اور الفاظ وکلمات کی بندش کو اس قدر ملحوظ رکھتے ہیں کہ اُردو زبان کی شرینی پھیکی پڑنے لگتی ہے؛ لیکن مولانا نے ترجمہ اس انداز سے کیا ہے کہ مفہوم الفاظ کے مدلول کے دائرے میں رہے اور زبان وبیان کی چاشنی بھی برقرار رہے، مثلاً: ''لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ'' (یوسف: ۱۱۱) کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

بے شک ان لوگوں کی داستانوں میں سمجھدار لوگوں کے لئے عبرت کا سامان ہے۔

اسی طرح ''وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ '' (آل عمران: ۲۶) کا ترجمہ کیا ہے :

جسے چاہیں عزت سے ہمکنار کریں اور جسے چاہیں ذلت سے دوچار۔

(۳) اُردو محاورے کی رعایت : ترجمہ کے دوران اُردو محاورات وتعبیرات کو جس خوبی اور شائستگی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے، وہ یقیناً مولانا کے ادبی ذوق کا کمال ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

(الف) ''اَرَاَيْتُمْ ''۔ (سورہ ملک: ۳۰)

''بھلا دیکھو تو سہی''۔ (ج: ۲، ص: ۷۵۹)

(ب) ''وَ اِنِّیْ لَاَ ظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا''۔(بنی اسرائیل:۱۰۲)

''اے فرعون میرا خیال ہے کہ ضرور تیری شامت آچکی ہے''۔(۱/۸۳۸)

(ج) ''قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ''۔(التوبۃ:۳۰)

''اللہ انھیں غارت کرے''۔(۱/۵۷۴)

(۴) عصمت انبیا کا لحاظ : ترجمہ وتفسیر کے دوران عصمت انبیاء کا لحاظ ایک نازک امر ہے اور تفسیر کے مقابلے ترجمے میں اس کی نزاکت وحساسیت اور بڑھ جاتی ہے؛ کیوں کہ تفسیر میں انسان کے اپنے الفاظ ہوتے ہیں، وہ اپنے اختیار سے مناسب الفاظ چنتا ہے، جب کہ ترجمہ میں خدائی الفاظ کا پابند رہنا پڑتا ہے، ذرا سی غفلت سے قلم پھسل جاتا ہے، مولانا نے از اول تا آخر اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ ترجمہ میں کوئی ایسا لفظ نہ آئے، جس سے انبیا کی عصمت پر حرف آتا ہو؛ چنانچہ سورۂ یوسف آیت نمبر: ۲۴ کا ترجمہ یوں کیا ہے :

وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ۔ (یوسف:۲۴)

اور اس عورت نے تو یوسف سے برائی کا ارادہ کر ہی لیا تھا، اگر یوسف نے اپنے پروردگار کی دلیل نہ دیکھ لی ہوتی تو اس کو بھی اسی طرح کا خیال پیدا ہوجاتا۔(آسان تفسیر:۶۹۵)

(۵) بین القوسین کا وضاحتی اضافہ : خدا کا کلام واضح اور مکمل ہے، اس کی وضاحت ہمارے کسی اضافے کی نعوذ باللہ محتاج نہیں ہے؛ لیکن کبھی ناواقفیت یا کم علمی یا عربی ناشناسی کی وجہ سے پڑھنے والے کو بات واضح طور پر سمجھ میں نہیں آتی ہے، اسی لئے مولانا نے ایسے موقع پر وضاحتی بین القوسین کا اضافہ کیا ہے، پورا ترجمہ قرآن اس کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے، بطور نمونہ یہاں ایک مثال پیش کی جاتی ہے :

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ۔ (الانعام:۸۲)

جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) کی آمیزش سے محفوظ رکھا۔(ج:۱،ص:۴۳۷)

یہاں بریکٹ میں شرک لکھنے سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آیت میں ظلم سے مراد ہر طرح کا ظلم نہیں؛ بلکہ ظلم کی ایک خاص صورت شرک مراد ہے۔

(۶) صحابہ سے منقول معانی کی ترجیح : کسی لفظ کے ایک سے زیادہ معانی ہوں اور صحابہ کرامؓ سے اس لفظ کا کوئی ایک معنی مروی ہو تو ترجمہ میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے، خاص طور پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی معانی الفاظ کو ترجیح دی گئی ہے، مثلاً سورہ کہف کی آیت: ''وَكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ''میں موجود ''ثمر'' کا ترجمہ مولانا نے مال واسباب سے کیا ہے اور اس معنی کو اختیار کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں :

''ثمر'' کا معنی یہاں حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے سونے چاندی اور دوسرے مالوں سے کیا ہے، اسی لحاظ سے ترجمہ کیا گیا ہے۔(۱/ ۸۵۵)

(۷) **مختلف معانی کو جامع :** کسی لفظ کے ایک سے زیادہ معانی ہوں اور آیت میں ایک سے زیادہ معانی مراد لینے کی گنجائش ہو تو ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ لفظ ان مختلف معانی کو شامل ہو جائے، مثلاً: سورۂ بقرہ کی آیت: ۲۶۵ میں ایک لفظ ''تثبیتاً'' آیا ہے، امام شعبیؒ سے اس کا معنی ''تصدیق ویقین'' اور قتادہؒ سے ''نیت'' کے نقل کئے گئے ہیں، مولانا نے اس کا ترجمہ ''آمادگی'' سے کیا ہے کہ دلوں کی آمادگی ہی کا نام یقین اور اخلاص نیت ہے۔(دیکھئے: ۱/ ۲۱۵)

(۸) **دفع اعتراض :** کسی لفظ کا کوئی خاص معنی مراد لینے سے اسلام پر اعتراض ہوتا ہو اور نصوص کے دائرے میں رہ کر اس لفظ کا ایسا معنی مراد لینے کی گنجائش ہو جس سے وہ اعتراض دفع ہو جاتا ہو تو ترجمے میں اس دوسرے معنی کو اختیار کیا گیا ہے، مثلاً آیت جزیہ: ''حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ'' (توبہ: ۲۹) میں موجود لفظ 'صاغرون' کا ترجمہ عام طور پر ذلیل ورسوا سے کیا جاتا ہے، مگر یہ معنی مراد لینے میں اعتراض ہوتا ہے کہ اسلام تکریم بنی آدم کے کلی اُصول پر عمل کرنے کے بجائے نوع انسان کی ایک بڑی تعداد کی تذلیل چاہتا ہے؛ لیکن مولانا نے اس کا جو ترجمہ کیا ہے، اس سے یہ اعتراض ہی پیدا نہیں ہوتا؛ چنانچہ مولانا اس آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

جب تک وہ رعیت بن کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ ادا نہ کر دیں۔(۱/ ۵۷۳)

(۹) **لفظ کے سیاق وسباق کی رعایت :** کوئی لفظ کسی خاص معنی میں استعمال ہوتا ہو؛ لیکن وہ معنی وہاں مراد لینے سے آیت کا مفہوم بدل جاتا ہو تو پھر ترجمہ میں معنی موضوع لہ سے اوپر اُٹھ کر اس کا ایسا معنی مراد لیا گیا ہے، جو لفظ کے سیاق وسباق سے میل کھاتا ہو، مثلاً: ''لعل'' کا لفظ عربی میں اُمید کے لئے آتا ہے، مگر سورۂ ہود کی آیت: ''فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ'' (ہود: ۱۲) میں ''لعل'' کو اُمید کے معنی میں نہیں لیا جاسکتا؛ کیوں کہ رسول سے یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ وہ وحی کا بعض حصہ نعوذ باللہ چھوڑ دیں؛ اس لئے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا گیا :

یہ بات توقع سے بعید ہے کہ آپ کی طرف جو وحی کی جاتی ہے، آپ ان میں سے بعض کو چھوڑ بیٹھیں۔(ج: ۱، ص: ۶۵۸)

(۱۰) **رموز تحریر کا اہتمام :** لکھی ہوئی عبارت کو سمجھنے اور لکھنے والے کی مراد تک پہنچنے میں رموزِ تحریر اور قواعد املا کا بہت بڑا دخل ہے، نیز اس سے عبارت کا حسن بھی دوبالا ہو جاتا ہے، مولانا نے نہ صرف اپنے ترجمے میں؛ بلکہ توضیحی حاشیہ میں بھی کتاب کی ابتدا سے اخیر تک رموزِ تحریر اور قواعد املا کا اہتمام کیا ہے، یہ سچ ہے کہ ہمارے حلقۂ مدارس میں اس پہلو کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا، مگر مولانا کا ذوقِ سلیم رموزِ کتابت سے بے اعتنائی اور قواعد املا سے بے توجہی کو کسی صورت قبول نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ مولانا کی تمام نگارشات کتابت کے رموز وعلامات سے مرصع رہتی ہیں۔

تفسیری حاشیہ کی خوبیاں

(۱) مسائل کا استنباط : حضرت الاستاذ مولانا رحمانی کی شخصیت سے فقاہت وتفقہ کا تعلق ایسا ہی ہے جیسے شاخ گل میں بادِ سحر گاہی کا نم، مولانا واقعی فقیہ النفس ہیں، پیچیدہ سے پیچیدہ تر گتھیاں ناخن فقاہت سے بہ آسانی سلجھا دیتے ہیں، مولانا کا یہ فقیہانہ مزاج و مذاق زیر تبصرہ تفسیر میں نہ صرف جھلکتا ہے؛ بلکہ چھلکتا ہے، مولانا نے آیاتِ احکام کے علاوہ دوسری آیتوں سے بھی احکام ومسائل کا جو استنباط کیا ہے، جو ان کی دقتِ نظر اور فکر رسا کا غماز ہے، مولانا کی تفسیر کا ایک بڑا حصہ اس طرح کے مستنبط مسائل پر مشتمل ہے، یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

(الف) سورۃ توبہ کی آیت ''خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ''(التوبۃ:۱۰۳) سے مولانا نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ نابالغ پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے؛ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں :

> اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زکوٰۃ بالغوں پر واجب ہے، نابالغوں پر نہیں؛ کیوں کہ زکوٰۃ کو گناہوں سے پاک کرنے کا ذریعہ بتایا گیا ہے اور نابالغ کے افعال پر گناہ کا اطلاق نہیں ہوتا؛ اس لئے کہ جب تک بالغ نہ ہوجائیں، وہ شرعی احکام کے مخاطب ہی نہیں ہیں ۔(۱/ ۶۰۴)

(ب) سورۂ نسا کی آیت: ''فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ''(النساء:۶۵) سے یہ اُصولی مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ بہ طریقِ یقین ثابت حدیث کا منکر کافر ہے، مولانا فرماتے ہیں :

> اس ارشاد ربانی سے معلوم ہوا کہ جس بات کا حدیث نبوی سے ثابت ہونا یقینی طور پر معلوم ہو، اس کا انکار بھی موجبِ کفر ہے اور انسان کو دائرہ ایمان سے باہر نکال دیتا ہے؛ اس لئے کہ رسول کے حکم کو بھی ماننا ضروری ہے ۔(۱/ ۳۱۸)

(ج) سورۂ نساء کی آیت: ۴۶ سے مولانا نے یہ بات اخذ کی ہے کہ غیر اسلامی فکر کی ترجمانی کرنے والے الفاظ گو معنوی اعتبار سے صحیح ہوں، ان کا استعمال مناسب نہیں ہے، مولانا لکھتے ہیں :

> اس سے معلوم ہوا کہ دوسری قومیں اگر ایسے الفاظ استعمال کریں، جن کے گو درست معنی بھی ہوں؛ لیکن وہ اسے کسی غیر اسلامی فکر کی ترجمانی کے لئے بھی کہا کرتے ہوں، تو ایسے الفاظ کے استعمال سے گریز کرنا چاہئے ۔(۱/ ۳۱۳)

(د) سورۂ بقرہ کی آیت: ''وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ ''(البقرۃ:۲۸۲) سے یہ بات مستخرج کی ہے کہ غیر سودی قرض کے ادارے حساب وکتاب کی اُجرت حاصل کرسکتے ہیں، مولانا رقم فرماتے ہیں :

......اور یہ بھی معلوم ہوا کہ غیر سودی قرض کے سلسلہ میں جو ادارے قائم ہیں، وہ مقروض سے حساب و کتاب کے عملہ کی اجرت حاصل کر سکتے ہیں؛ کیوں کہ قرض لکھنا اصل میں اسی کی ذمہ داری ہے؛ البتہ حقیقی اخراجات سے زیادہ لینا جائز نہیں۔(۲۲۲/۱)

مولانا نے آیات کریمہ سے نہ صرف جزوی وفروعی مسائل کا استنباط کیا ہے؛ بلکہ فقہی اُصول وضوابط کا بھی استخراج کیا ہے، مثلاً :

(الف) سورۂ مائدہ کی آیت : '' وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ''(المائدۃ:۲) سے سد ذرائع کا استنباط کیا ہے۔(۳۵۸/۱)

(ب) سورۂ انعام کی آیت: ''وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ''(الانعام:۱۰۸) سے بھی سد ذرائع کو ثابت کیا ہے۔(۴۱۷/۱)

(ج) حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے انھیں کنویں میں ڈال کر ان کی قمیص جھوٹے خون میں رنگ دی تھی اور اپنے والد سے کہا تھا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب قمیص صحیح سالم دیکھی تو سمجھ گئے کہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں، مولانا نے اس واقعہ سے قرینۂ قاطعہ کے دلیل ہونے کو ثابت کیا ہے؛ کیوں کہ قمیص کا صحیح سالم ہونا اس بات کا قطعی قرینہ تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بھیڑیے نے نہیں کھایا ہے۔(دیکھئے:۲۹۲/۱)

مولانا نے فقہی مسائل کے علاوہ عقیدے کے بھی مسائل کا استنباط کیا ہے، مثلاً سورۂ نوح کی آیت : ''اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ''(نوح:۲۵) سے عذاب قبر کو ثابت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

یعنی قومِ نوح پر طوفان کا عذاب بھی آیا اور اب وہ آگ کے عذاب میں ڈال دیئے گئے ہیں، ظاہر ہے کہ اس عذاب سے عذابِ قبر مراد ہے، اس سے قبر میں عذاب کا ثبوت ملتا ہے؛ جیسا کہ اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے۔(۷۸۷/۲)

(۲) ردشبہات : چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری ازازل تا امروز جاری ہے، ہمیشہ سے اعداءِ اسلام قرآن وحدیث میں شبہات پیدا کرنے کے لئے کوشاں رہے ہیں؛ تاکہ ایمان والوں کا ایمان متزلزل ہو جائے، مولانا نے اپنی اس تفسیر میں بہت مناسب اور مثبت انداز میں ان شبہات کا رد کیا ہے، مثلاً: اسلام نے عورتوں کی گواہی کو مردوں کی گواہی کے مقابل نصف مانا ہے، اعدائے اسلام کی طرف سے اس پر کافی کچھ کہا جاتا ہے، مولانا ان کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے رقم طراز ہیں :

گواہی میں دو عورت کو ایک مرد کے برابر اس لئے رکھا گیا ہے کہ عورتوں میں جذبات کا عنصر زیادہ ہے، یہ ان کے منصب مادری کے لئے مناسب بھی ہے، جذبات کی فراوانی قوت حافظہ کو بھی متاثر کرتی ہے اور کسی واقعہ کو سمجھنے اور اخذ کرنے کی صلاحیت کو بھی، خود مرد اگر سخت غصہ میں ہو یا خوشی سے سرشار ہو تو اس حالت میں اس کے قوائے فکری کم کام کر پاتے ہیں، اس کے علاوہ عورتوں کے دماغ کا حجم بہ نسبت مردوں کے کم ہوتا ہے، مرد کے بھیجہ کا تناسب اس کے جسم سے ایک اور چالیس کا ہوتا ہے اور عورت کا ایک اور چوالیس کا، ظاہر ہے کہ اس کا اثر کسی بات کو سمجھنے اور اس کو یاد رکھنے پر بھی پڑتا ہوگا۔(۱/۲۲۲)

(۳) ازالۂ غلط فہمی : قرآن کے ترجمہ وتفسیر کا مطالعہ کرتے ہوئے بعض مقامات ایسے آتے ہیں کہ قارئین وہاں کسی غلط فہمی کا شکار ہو سکتے ہیں، مولانا نے ایسے مقامات پر پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کے ازالہ کی سعی مشکور کی ہے، مثلاً قرآن کریم میں مختلف مقامات پر آپ ﷺ کے ذریعہ یہ بات کہلائی گئی ہے کہ میں تو صرف وحی کی اتباع کرتا ہوں، جیسا کہ سورۂ انعام میں ہے: ''اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ'' (الانعام: ۵۰) اس سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ آپ ﷺ اجتہاد نہیں فرماتے تھے، مولانا اس غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

بعض حضرات نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ صرف وحی پر عمل کرتے تھے، قیاس واجتہاد سے کام نہ لیتے تھے؛ لیکن یہ درست نہیں؛ کیوں کہ آپ سے اجتہاد کرنا ثابت ہے اور علماء نے اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے؛ البتہ عام لوگوں کے اجتہاد اور رسول اللہ ﷺ کے اجتہاد میں فرق یہ تھا کہ اگر آپ سے اجتہاد میں کوئی لغزش ہو جاتی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر متنبہ فرما دیا جاتا تھا۔(۱/۴۲۵)

قرآن نے یہ اُصول بتایا ہے کہ ایک نفس دوسرے نفس کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا: ''وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی'' (الانعام: ۱۶۴) اس سے کسی کو غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ ایصالِ ثواب درست عمل نہ ہو، مولانا اس غلط فہمی کا یوں ازالہ فرماتے ہیں :

اس ارشاد سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام میں ایصالِ عذاب کا کوئی تصور نہیں کہ ایک شخص گناہ کا مرتکب ہو اور دوسرے کو اس کا عذاب پہنچا دے، جیسا کہ بعض باطل گروہوں کا خیال ہے، اسی طرح یہ آیت ایصالِ ثواب کے مغایر نہیں؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ ایک شخص کا گناہ دوسرے پر نہیں ڈالتے؛ لیکن ایک شخص کی نیکی

> گویا اُس کی دُعاء کو قبول کرتے ہوئے اپنے فضل وکرم سے دوسرے کو پہنچادیں تو یہ اس آیت کے خلاف نہیں؛ جب کہ متعدد حدیثوں سے تلاوت قرآن اور نیک اعمال کے ثواب کا ایصال کرنا ثابت ہے۔(۱/۴۶۹)

(۴) باطل وگمراہ فرق ومذاہب کا رد : مولانا نے اپنی اس تفسیر میں باطل وگمراہ فرقوں کا پرزور مدلل اور سلجھے ہوئے انداز میں تعاقب کیا ہے؛لیکن سنجیدگی کا دامن کہیں ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیا،طنز واستہزا کے خار میں اپنا دامن کبھی اُلجھنے نہ دیا،یوں تو مولانا نے ہراس باطل وگمراہ فرقے کی بیخ کنی کی ہے،جو اسلام کے چہرے کو داغ دار کرنا چاہتا ہے اور مسلمانوں کو راہِ راست سے ہٹا کر کجروی کی پگڈنڈیوں پر لگانا چاہتا ہے؛لیکن یہاں ان سب کا احاطہ مشکل ہے؛اس لئے ان میں سے اہم کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

● ردعیسائیت : آبادی کے اعتبار سے عیسائیت کو اس دنیا کا سب سے بڑا مذہب مانا جاتا ہے، یہ گو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہے؛مگر حقیقت میں سینٹ پال کی تعلیمات کا مجموعہ ہے،اس کے ماننے والوں کی یہ کوشش رہی ہے اور ہے کہ اسلام کے مقابلے میں عیسائیت کو ہر اعتبار سے علمی وعقلی انداز میں برتر و بہتر قرار دیا جائے اور اسلام کی تعلیمات کو جہاں تک ہوسکے مسخ کیا جائے،مولانا نے اپنی اس تفسیر میں مختلف مواقع پر اس مذہب کے بطلان کو واضح کیا ہے؛چنانچہ عیسائیوں کے مشہور عقیدہ ''عقیدۂ کفار'' کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کے بجائے کسی اور بھائی کو روکنا قبول نہیں فرمایا،اس سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کی شریعت کا قانون بھی یہی تھا کہ ایک شخص کے جرم کی سزا دوسرے کو نہیں دی جاسکتی،بخلاف عیسائیوں کے عقیدہ کفارہ کے،کہ ان کے عقیدہ کے مطابق غلطی حضرت آدم علیہ السلام نے کی اور کفارہ میں حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کو سولی دے دی گئی۔(۱/۷۱۵)

● یہودیت : یہودی مذہب پیروکار تعداد میں گو بہت کم ہیں؛لیکن انھوں نے اپنی شاطرانہ اور عیارانہ کوششوں کے ذریعہ دنیا کی معیشت وسیاست پر اپنا ایک دبدبہ بنا رکھا ہے،اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ''یورپ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے''مولانا نے اس تفسیر میں یہودیوں کے باطل خیالات کی بھی تردید فرمائی ہے،مثلاً یہودیوں کا یہ خیال ہے کہ وہ دنیا میں خدا کی سب سے افضل مخلوق ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہماری افضلیت کا بیان قرآن میں بھی موجود ہے،جیسا کہ سورۂ جاثیہ میں ہے:''فَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ''(الجاثیہ:۱۶)مولانا نے اس آیت کی تفسیر اس انداز سے کی ہے کہ یہودیوں کے خیال باطل کی تردید ہوجاتی ہے،مولانا لکھتے ہیں :

کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر انبیاء پیدا فرمائے اور ہر دور میں وہی قوم فضیلت وبرتری کی حامل ہوتی ہے، جس کو تعلیمات نبوی سے نوازا گیا ہو، جیسے اس دور میں اُمتِ محمدیہ۔(۵۳۵/۲)

● ردِقادیانیت : مولانا نے قادیانی فرقے کا اس شدت کے ساتھ تعاقب کیا ہے کہ کبھی کبھی یہ گمان ہوتا ہے کہ اس تفسیر کے بنیادی مقاصد میں سے ایک بہت ہی اہم مقصد ردقادیانیت ہے، جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ فتنۂ قادیانیت سے متعلق مولانا کس قدر فکرمند ہیں، مولانا نے جس باریک بینی سے فتنۂ قادیانیت کے خلاف مختلف آیتوں سے استدلال کیا ہے، وہ مولانا کی نگاہ دُوررس کا ہی حصہ ہے، مثلاً: ''فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا''(النساء:۴۱) سے مولانا نے ختم نبوت پر استدلال کیا ہے، مولانا لکھتے ہیں :

یعنی ہر اُمت پر ان کے نبی بہ طور گواہ پیش ہوں گے، اور ان پیغمبروں پر رسول اللہ ﷺ گواہ بنائے جائیں گے، پھر مجرمین کی بابت سزا کا فیصلہ ہوگا، گویا آپ ﷺ کو آخری گواہ کی حیثیت سے پیش کیا جائے گا، اس میں آپ ﷺ کے آخری نبی ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے، اگر آپ ﷺ کے بعد کوئی اور نبی اور اس اُمت کے بعد کوئی اور اُمت کا وجود متوقع ہوتا تو ضرور تھا کہ قرآن نے اس کا بھی ذکر کیا ہوتا۔(۳۰۹/۱)

مولانا نے اپنے تفسیری حواشی میں متعدد آیات سے نہ صرف ختم نبوت پر استدلال کیا ہے؛ بلکہ قادیانیوں کے دلائل کو رد بھی کیا ہے، مثلاً: قادیانی طبقہ سورۃ نساء کی آیت: ''وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ''(النساء:۶۹) سے دلیل پیش کرتا ہے کہ نبیوں کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا؛ اسی لئے تو کہا جارہا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے والے نبیوں کے ساتھ ہوں گے، مولانا اس دلیل کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

آیت اور روایت دونوں سے واضح ہے کہ اس رفاقت کا تعلق آخرت سے ہے، نہ کہ دنیا سے ؛ مگر افسوس کہ قادیانی حضرات اس آیت سے لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ انبیاء کی رفاقت کا وعدہ کیا گیا ہے ؛ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی (نعوذ باللہ) نبی آسکتے ہیں، جب ہی تو نبی کی رفاقت حاصل ہوسکتی ہے، جواب ظاہر ہے کہ آیت میں آخرت کی رفاقت مراد

ہے نہ کہ دنیا کی، اگر دنیا کی رفاقت مراد ہوتی تو پھر کوئی زمانہ نبی سے خالی نہ ہونا چاہئے تھا، اور ہر زمانہ میں نبیوں کی ایک جماعت موجود ہونی چاہئے تھی، کیوں کہ ''نبیین'' عربی قواعد کے لحاظ سے جمع کا صیغہ ہے۔ (۳۱۹/۱)

● **ردانکارِحدیث :** انکارِحدیث کا فتنہ بہت قدیم ہے، ہر زمانہ کے علمانے اس فتنہ کی مسلح انداز میں سرکوبی کرنے کی کوشش کی ہے، اس تفسیر میں بھی انکارِحدیث کی قلعی کھولی گئی ہے، صرف قرآن کو ماننے کا دعویٰ کرنے والوں کا جواب قرآن ہی کی آیتوں سے دینے کی کوشش کی گئی ہے؛ چنانچہ آیت قرآن ''اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَیَّ'' (الانعام: ۵۰) کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

> معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا ہر قول وفعل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور وحی کے حکم میں ہے، قرآن مجید — جس کے الفاظ بھی اللہ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں — وحی متلو ہے، یعنی ایسی وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے، اور حدیث نبوی — جس کے معانی اللہ کی طرف سے ہیں اور الفاظ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے — وحی غیر متلو ہے، جس کی تلاوت نہیں کی جاتی؛ لیکن وہ بھی حجت ہے۔ (۴۲۵/۱)

● **ردشیعیت :** حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو مسخ کرنے کے لئے سینٹ پال نے جس طرح کی کارستانیاں انجام دی تھیں، اسی طرح کی کارستانیاں عبداللہ بن سبا کی جانب سے اسلام کو مسخ کرنے کے لئے انجام دی گئیں؛ البتہ چوں کہ اسلام قیامت تک باقی رہنے والا مذہب ہے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خالق کائنات نے لی ہے؛ اس لئے عبداللہ بن سبا کی کوششیں رنگ نہ لاسکیں؛ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ایک طبقہ اس کا ہم نوا ہوگیا، جو شیعہ یا اہل تشیع کے نام سے مشہور ہوا، زیر تبصرہ تفسیر میں اس طبقہ کے عقائد ونظریات کا قرآنی آیات کی روشنی میں رد کیا گیا ہے؛ چنانچہ اہل تشیع کے فلسفۂ تقیہ کو رد کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

> اس سے روافض کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ جہاں خلافِ شریعت باتیں ہوں، وہاں 'تقیہ' کے طور پر شرکت کی جاسکتی ہے اور ہاں میں ہاں ملائی جاسکتی ہے؛ کیوں کہ ایسے لوگوں کی تائید کرنا تو کجا قرآن تو ان کے ساتھ بیٹھنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ (۴۳۳/۱)

آنحضور ﷺ نے بعض غزوات کے موقع پر حضرت علیؓ کو اپنا جانشین بنایا تھا، اس سے اہل تشیع حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل پر استدلال کرتے ہیں، مولانا ان کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

اس سے یقیناً رسول اللہ ﷺ کا حضرت علیؓ پر غیر معمولی اعتماد کرنا ظاہر ہوتا ہے؛ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو بعد کے لئے خلیفہ نامزد کر دیا تھا، اس کی حیثیت صرف عارضی طور پر اپنا نائب بنانے کی تھی کہ وہ آپ ﷺ کی عدم موجودگی میں انتظامی کاموں کو انجام دیں؛ چنانچہ آپ ﷺ نے متعدد بار حضرت عبداللہ بن اُم مکتومؓ کو بھی اپنی عدم موجودگی میں مدینہ منورہ کا ذمہ دار مقرر فرمایا ہے، بعض دفعہ دوسرے صحابہؓ کو بھی مقرر کیا ہے تو کیا ان سب کو آپ ﷺ کے بعد خلیفہ سمجھا جائے گا؟ (۱/۵۱۲)

● ردِ بدعات : بدعت وہ گمراہی ہے جس کا کرنے والا اسے حق سمجھ کر کرتا ہے، اس لئے کہا جاتا ہے کہ بدعتی کو توبہ کی توفیق نہیں ملتی؛ کیوں کہ وہ اسے گناہ کا کام ہی نہیں سمجھتا ہے، قرآن چوں کہ ضلالت و ہدایت کو پرکھنے کی بنیادی و اساسی کسوٹی ہے، اس لئے تفسیر میں قرآنی آیات کی روشنی میں بدعات کا رد کیا گیا ہے؛ چنانچہ سورۂ انعام کی آیت: ۵۰ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

اس آیت میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ کائنات کے خزانے اللہ نے اپنے کسی رسول کے حوالے نہیں کئے اور اسے مختار کل نہیں بنایا کہ وہ لوگوں پر رزق اور خوشحالی و آسانی کے دروازے کھولتا اور بند کرتا رہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے غیب کی بہت سی باتیں رسول اللہ ﷺ کو اور اُمت کی ضرورت کے مطابق آپ کے واسطہ سے اُمت کو بتائی ہیں، جیسے جنت و دوزخ وغیرہ؛ لیکن غیب کی تمام باتوں کا علم اللہ تعالیٰ نے کسی کو نہیں دیا ہے؛ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی نہیں، ''لا أعلم الغیب'' کا یہ مطلب بتانا کہ ''نہ یہ کہو کہ آپ غیب جان لیتا ہوں'' درست نہیں؛ اس لئے کہ قرآن مجید نے ذاتی اور عطائی، اپنے آپ حاصل ہونے والے اور اللہ تعالیٰ کے عطا کرنے سے حاصل ہونے والے علم غیب کی کوئی تفصیل نہیں کی ہے؛ بلکہ مطلقاً فرمایا گیا کہ میں غیب کی باتوں کو نہیں جانتا ہوں۔ (۱/۴۲۵)

● انکارِ تقلید کا رد : تقلید کی حیثیت یہ ہے کہ اس کا تعلق انتظامی اُمور سے ہے، نہ کہ تشریعی اُمور سے؛ لہٰذا تقلید کو تشریعی اُمور کا درجہ دینا شریعت میں زیادتی کے مترادف ہوگا، اور اس کی ضرورت کا سرے سے انکار کرنا ایک طرح کی ناسمجھی ہوگی، اس تفسیر میں انکارِ تقلید کی فکر کا رد کیا گیا ہے اور تقلید کی ضرورت کو واضح کیا گیا ہے؛ چنانچہ سورۂ فاتحہ کی آیت: ''صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں :

معلوم ہوا کہ قرآن مجید نے جہاں کہیں آباء واجداد کی اتباع سے منع کیا ہے، اس سے وہ آباء واجداد مراد ہیں جو حق راستے سے ہٹے ہوئے تھے، جو لوگ راہ حق پر ثابت قدم تھے ان کی راہ پر قائم رہنے کی تو دُعا کرائی گئی ہے، اسی سے ائمۂ مجتہدین کی تقلید کا جائز ہونا ثابت ہوتا ہے؛ کیوں کہ وہ صالحین میں تھے۔(۱/۱۰۶)

اسی طرح سورۂ انعام کی آیت: ''أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ'' (الانعام:۹۰) کے تفسیری حاشیہ میں ہے :

معلوم ہوا کہ جو آباء واجداد اور گذرے ہوئے لوگ ہدایت پر قائم ہیں، ان کی اتباع کرنی چاہئے، نہ یہ درست ہے کہ انسان آنکھ بند کرکے اپنے آباء واجداد کی باتوں کو اور رسوم ورواجات کو قبول کرلے اور یہ نہ دیکھے کہ وہ حق پر تھے بھی یا نہیں؟ اور نہ یہ درست ہے کہ علماء صالحین کے طریقہ کو محض یہ کہہ کر رد کردیا جائے کہ یہ آباء واجداد کی پیروی ہے، نہ کہ اللہ اور رسول کی ؛ کیوں کہ اگر علم اور تقویٰ کی بنیاد پر کسی شخص کی پیروی کی جائے تو یہ بالواسطہ اللہ اور اس کے رسول ہی کی اطاعت ہے۔(۱/۴۳۹)

● ردِ استشراق : اسلام کے خلاف مغرب کی طرف سے چلائی جانے والی تحریکات میں استشراق ایک ایسی نمائندہ تحریک ہے جس نے اسلام کے پاکیزہ دامن کو داغدار کرنے اور دین حق کو مشتبہ کرنے میں کسی طرح کی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، اس تحریک سے مربوط اسکالرس نے علمی وعقلی بنیادوں پر مرتب اسلام مخالف لٹریچر سے کتب خانے بھر دیئے ہیں، زیر تبصرہ تفسیر میں مستشرقین کے حملوں کا علمی وعقلی بنیادوں پر جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے، مثلاً جزیہ کے مسئلہ میں — جس پر مستشرقین کافی اُدھم مچاتے ہیں — مولانا نے بہت سلجھے ہوئے انداز میں جواب دیا ہے؛ چنانچہ لکھتے ہیں :

جزیہ مفسرین کی تحقیق کے مطابق 'جزاء' سے ماخوذ ہے، یعنی یہ رقم بدلہ اور معاوضہ کے طور پر وصول کی جاتی ہے، بعض احناف نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ مملکت کا دفاع اور اس کی حفاظت غیر مسلم شہریوں کے ذمہ نہیں رکھی گئی ؛ بلکہ مسلمانوں نے خود اُن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، اس کے معاوضہ کے طور پر جزیہ وصول کیا جاتا ہے: ''إنما وجب بدلاً عن النصر والجهاد'' (تفسیر قرطبی : ۸/۱۱۴) عام طور پر جزیہ کے بارے میں بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے، اصل یہ ہے کہ کسی بھی مملکت کا انتظام اور دفاع مالی وسائل کے بغیر نہیں ہوسکتا؛ چنانچہ مسلمانوں سے اس مقصد کے لئے

زرعی پیداوار میں عشر اور دوسرے مالوں میں زکوۃ لی جاتی ہے، اگر یہی زکوۃ اور عشر غیر مسلموں پر واجب قرار دیا جاتا تو یہ ان کی مذہبی آزادی کے مغائر ہوتا اور ان کو مسلمانوں کے ایک مذہبی عمل پر مجبور کرنا لازم آتا؛ اس لئے ان کے لئے ایک خصوصی ٹیکس عائد کیا گیا، جو زرعی پیداوار میں 'خراج' کے نام سے ہے، اور دوسرا جزیہ ہے، جزیہ کے واجب کئے جانے کا سبب محض غیر مسلم ہونا نہیں ہے؛ اگر غیر مسلم ہونے کی وجہ سے جزیہ واجب ہوتا تو بوڑھوں، بچوں، عورتوں، معذوروں، سب پر واجب ہوتا؛ لیکن یہ صرف ایسے جوانوں پر واجب ہے، جو کمانے کی طاقت رکھتے ہیں، حضرت عمرؓ نے جزیہ کی جو شرح مقرر کی وہ مالداروں پر سالانہ ۴۸/درہم، متوسط آمدنی کے لوگوں پر ۲۴/درہم اور کم آمدنی والوں پر ۱۲/درہم، (مفاتیح الغیب: ۷/۱۲۸) سالانہ ۱۲/درہم تقریباً ۴/گرام چاندی بنتی ہے، غور کیا جائے کہ یہ کتنا ہلکا اور معمولی ٹیکس ہے۔ (۱/۴۷۵)

● ردِ نیچریت : نیچریت دراصل اعتزالی فکر کا جدید قالب ہے، جو عقل کو نشانِ راہ کے بجائے منزل سمجھتی ہے، جو بات عقل کے چوکھٹے میں نہ سما سکے اس کا سرے سے انکار یا ایسی تاویل جو انکار کے مترادف ہو، اس فکر کا طرۂ امتیاز ہے، مثلاً یہ لوگ معجزات کی ایسی تاویل کرتے ہیں جو کہ انکار معجزات کے مترادف ہوتی ہے؛ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا والے معجزہ کی تاویل کرتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک طرح کا ''مسمریزم'' تھا، مولانا نے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے :

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ ظاہر ہونے والے اس معجزہ کو ''مسمریزم'' کہنا یا یہ سمجھنا کہ کسی شئ میں پارہ بھر دیا گیا تھا اور آگ پر رکھنے کی وجہ سے اس میں حرکت پیدا ہوگئی تھی، درست نہیں؛ کیوں کہ یہ تو ایک عام نوعیت کا واقعہ ہوتا اور ایسا کرتب ہوتا جو مداری سرِ بازار دکھاتے پھرتے ہیں، اگر نبی کا معجزہ بھی ایسا ہی ہوتا تو اسے اس اہتمام سے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہوتی اور پھر لوگ اس منظر کو دیکھ کر کیوں متاثر ہوتے اور ایمان لاتے؟ (۱/۵۰۴)

● ردمہدویت : حدیث نبوی میں قیامت کے قریب مہدی موعود کے آنے کی بات کہی گئی ہے، اس طرح کی احادیث کا سہارا لے کر بہت سے جھوٹے مدعیان مہدویت ظاہر ہوئے ہیں، ہمارے ملک ہندوستان میں ایک شخصیت سید محمد جونپوری کے نام سے گذری ہے، ان کی طرف یہ بات منسوب ہے کہ انھوں نے بھی مہدی

ہونے کا دعویٰ کیا تھا، ان کے ماننے والوں کا طبقہ ابھی بھی موجود ہے اور مہدوی کے نام سے موسوم ہے، مولانا نے اپنے اس تفسیری حاشیہ میں حسبِ موقع اس طبقہ کے باطل خیالات کی تردید کی ہے، جیسا کہ سورۂ قیامۃ کی آیت : ''ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ'' (القیامۃ:۱۹) کے حاشیہ میں لکھتے ہیں :

> ......جیسے اللہ تعالیٰ نے آپ پر الفاظ قرآنی اُتارے ہیں، ویسے ہی معانی قرآن کو بھی اُتارا ہے، حدیث ان ہی معانی قرآن کا نام ہے؛ اس لئے حدیثیں بھی حجت ہیں اور اللہ ہی کی طرف سے ہیں — آج کل مہدوی حضرات — جو سید محمد جونپوری کو امام مہدی مانتے ہیں — کہتے ہیں کہ معانی قرآن امام مہدی پر اُتارے گئے، یہ آیت اس کی تردید کرتی ہے؛ کیوں کہ اس میں رسول اللہ ﷺ سے خطاب ہے؛ اس لئے یقیناً قرآن مجید کی تشریحات بھی آپ ہی پر نازل ہوئی ہیں؛ چنانچہ خود قرآن مجید نے آپ ﷺ کی ذمہ داریوں میں اس بات کو بھی شامل کیا ہے کہ آپ لوگوں کے لئے قرآن کی تشریح کریں گے: ''لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ'' (النحل:۴۴) پس، قرآن مجید کی تشریح رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ مکمل ہو چکی، امام مہدی پر قرآن مجید کی تشریح اُترنے کی بات درست نہیں ہے؛ بلکہ ان کا کام اپنے زمانہ میں قرآن کے احکام کو نافذ کرنا ہے، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی بات کے آجانے کے سینکڑوں سال بعد اس کی تشریحات آئیں؟ (۸۱۵/۲)

(۵) اسلامی فکر کی ترجمانی : فکری سرحدوں کی حفاظت ملکی سرحدوں سے زیادہ اہم ہوا کرتی ہے؛ کیوں کہ ملکی سرحدوں کی حفاظت نہ کرنے کی صورت میں جان و مال کی تباہی ہوتی ہے اور فکری سرحدوں کی حفاظت نہ کرنے کی صورت میں ایمان ویقین خاکستر ہوتا ہے، اسی بنا پر اس تفسیر میں اسلامی فکر کو موقع بہ موقع واضح کیا گیا ہے، سورہ نساء کی پہلی آیت کا حاشیہ ملاحظہ ہو :

> یہ اسلام کا ایک انقلابی نظریہ ہے کہ جیسے خدا ایک ہے، ویسے ہی پوری انسانیت ایک ہی باپ سے پیدا ہوئی ہے، یہ وہ عقیدہ ہے جو انسانیت کی طبقاتی تقسیم اور رنگ ونسل کی بنیاد پر اونچ نیچ کے تصور کا قلع قمع کرتی ہے، ہندو مذہب میں یہ تصور تھا کہ کچھ لوگ خدا کے منھ سے، کچھ لوگ اس کے بازوؤں سے، کچھ لوگ اس کی رانوں سے اور کچھ لوگ اس کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں؛ اس لئے پیدائشی طور پر انسانیت کا ایک طبقہ معزز اور دوسرا ذلیل ہے، اس طرح کی طبقاتی تقسیم کم وبیش اکثر مذاہب

اورنظام ہائے حیات میں موجود رہی ہے ؛ لیکن قرآن کہتا ہے کہ تمام انسان کی پیدائش انسان اول سے ہوئی ہے ؛ اس لئے وہ سب بحیثیت انسان برابر ہیں، محض رنگ ونسل اور علاقہ وزبان کی بنیاد پر ان میں تفریق کی گنجائش نہیں۔(۲۸۹/۱)

(۶) مغربی افکار ونظریات کی تردید : آج مسلم معاشرے میں مغربی افکار ونظریات کا ایسا زلزلہ بپا ہے کہ فکری سرحدیں متزلزل ہوکر رہ گئی ہیں، اس تفسیر میں مغرب سے درآئی فکری یلغار کا بھی مقابلہ کیا گیا ہے، مغرب سے درآئی فکری یلغار میں ایک اہم یلغار مساوات مرد وزن اور حریت نسواں کی فکر ہے، مولانا اس کا بلیغ انداز میں جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام ہی سے ان کا جوڑا حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا فرمایا، اس میں ایک بلیغ حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ عورت مرد کا ایک حصہ اوراس کی تکمیل ہے، آج عورتوں کی آزادی کے نام سے جو تحریکیں چل رہی ہیں، انھوں نے مردوں اور عورتوں کو دو فریق بنادیا ہے، اور ظاہر ہے کہ انسان اپنے فریق کے تئیں مخاصمت کا جذبہ زیادہ رکھتا ہے محبت کا کم، قرآن مجید نے یہ تصور دیا کہ مرد عورتوں کو اپنا حصہ اور جزء تصور کریں اور ظاہر ہے کہ اپنے جزء کے تئیں محبت اور ایثار کا جذبہ ہوا کرتا ہے، نہ کہ مقابلہ اور مخاصمت کا۔(۲۸۹/۱)

(۷) ایجاز و جامعیت : ترجمہ کے ساتھ جو تفسیری حاشیہ چڑھایا گیا ہے، اس میں طویل بحثوں سے احتراز کیا گیا ہے اور ایجاز سے کام لیا گیا ہے ؛ لیکن اختصار وایجاز کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مفہوم واضح نہ ہو پائے ؛ بلکہ یہ تفسیری حاشیہ ایجاز کے ساتھ جامعیت کا پہلو بدرجۂ اتم اپنے اندر رکھتا ہے، مثلاً جہاد پر کئے جانے والے اعتراض کا مولانا نے ایجاز واختصار کی پوری رعایت کرتے ہوئے جامعیت کے ساتھ عقلی وعلمی، الزامی وتحقیقی جو جواب دیا ہے، وہ یقیناً ایجاز اور جامعیت کا عکاس ہے، مولانا فرماتے ہیں :

معلوم ہوا کہ جہاد صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی اُمت ہی پر فرض نہیں ہے ؛ بلکہ پچھلی اُمتوں پر بھی فرض تھا اور انھوں نے اپنے اپنے عہد میں حق وسچائی کے دشمنوں کے ساتھ جہاد فرمایا ہے، بائبل تو جنگ کے واقعات سے پُر ہے ہی، دوسری مذہبی کتابوں میں بھی جنگ کے واقعات بہ کثرت موجود ہیں، ہندو بھائی خود کو ''اہنسا'' اور ''عدم تشدد'' کا علمبردار قرار دیتے ہیں ؛ لیکن رامائن اور مہابھارت جنگی قصوں اور داستانوں کے سوا اور کیا ہے؟ دراصل حق کی حمایت اور ناحق کی مخالفت میں اٹھ کھڑا ہونا اور اس

کے لئے ضرورت کے مطابق طاقت کا استعمال کرنا ایک پسندیدہ امر ہے، نہ کہ مذموم وناپسندیدہ، ظلم سے پنجہ آزمانہ ہونا اور ظالم ومظلوم کے ساتھ ایک ہی سلوک روا رکھنا یقیناً مظلوم کے ساتھ زیادتی اور انصاف کا خون کرنے کے مترادف ہے؛ اس لئے جہاد —— اگر صحیح جذبہ سے ہو اور قانونِ شریعت کے دائرہ میں ہو —— تو ایک منصفانہ عمل ہے۔(۲۶۹/۱)

(۸) شیریں زبانی وشگفتہ بیانی : حضرت الاستاذ مولانا رحمانی کی شخصیت ادبی مذاق وفقہی مزاج دونوں کو جامع ہے، بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مولانا ''ادیب الفقہاء وفقیہ الادباء'' ہیں، سخت وخشک زمین میں بھی مولانا کا قلم شیریں زبانی وشگفتہ بیانی کے وہ گل ولالہ بکھیرتا ہے کہ موضوع کوئی بھی ہو دل نہ تھکتا ہے نہ اُکتاتا ہے، اس تفسیر میں بھی مولانا کا قلم ادب وزبان کا حسین آہنگ لئے ہوئے ہے، مثلاً یہ عبارت پڑھئے کہ کس قدر اس میں ادبی ذوق کی تسکین کا سامان ہے :

جب کوئی شخص دعوت پیش کرے اور لوگ اسے قبول نہ کریں، وہ ان پر محبت کے پھول پھینکے اور لوگ اس کے راستہ میں نفرت کے کانٹے بچھائیں، وہ لوگوں پر پیار کی شبنم نثار کرتا ہو اور لوگ اس کی طرف دشمنی کے شعلے پھینکتے ہوں، تو فطری بات ہے کہ اس سے انسان رنجیدہ ہوتا ہے اور دل کا آبگینہ چور چور ہوجاتا ہے۔(۶۸۲/۱)

بسا اوقات مولانا اپنی نثری تحریروں میں شعر کا کوئی مصرع اس طرح پروتے ہیں کہ ادبی ذوق بے ساختہ انگڑائیاں لینے لگتا ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

● ......صرف جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء–۱۹۱۸ء) میں ستر (۷۰) لاکھ لوگ مارے گئے اور دو کروڑ سے زیادہ زخمی ہوئے اور جنگ عظیم دوم (۱۹۳۹–۱۹۴۵ء) میں ساٹھ سے ستر ملین لوگ مارے گئے اور ڈیڑھ ٹریلین ڈالر کا مالی خسارہ ہوا، (الموسوعة العربية العالمية) یہ دونوں جنگیں اصل میں عیسائی اکثریت ملکوں ہی کی مسلط کی ہوئی تھیں، حقیقت یہ ہے کہ: ''بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے''۔(۶۰۸/۱)

● اُمت کی تو ایسی لغزشیں بارگاہ خداوندی میں یوں ہی معاف ہیں، انبیاء کی شان اور ان کے مقام کے لحاظ سے اتنی معمولی بھول چوک پر بھی گرفت ہوجاتی ہے کہ جن کے رتبے ہیں، سوا ان کو سوا مشکل ہے۔(۱۲۲/۱)

● یہ ایسا وجد انگیز ترغیبی کلام ہے کہ نہ دینے والے ہاتھ بھی دینے کو بے قرار ہوجائیں اور بخیل سے بخیل شخص بھی اس کو سن کر اپنے قلب کو کشادہ پائے؛ لیکن ''مردِ ناداں پر کلامِ نرم ونازک بے اثر'' کے مصداق یہودیوں نے اسے اُلٹے تمسخر کا ذریعہ بنالیا۔(۱/ ۲۸۰)

(۹) حالاتِ حاضرہ پر تطبیق : ایک باکمال مفسر کی علامت یہ ہے کہ وہ چودہ سو سال پہلے نازل ہونے والی تعلیمات کو موجودہ حالات پر منطبق کرکے یہ ثابت کرے کہ قرآن کی ہدایات وتعلیمات تا قیامت پوری انسانیت کے لئے مشعلِ راہ ہیں، مولانا نے اپنی اس تفسیر میں یہ کام بحسن وخوبی انجام دیا ہے، مولانا نے حسب موقع قرآنی آیات کو موجودہ حالات پر تطبیق دی ہے۔

زکوٰۃ کے ایک مصرف ''فی الرقاب'' کے بارے میں مولانا تحریر فرماتے ہیں :

پانچواں مصرف 'گردنوں کو چھڑانا' ہے، یعنی غلاموں کو آزاد کرنا، اب یہ مصرف باقی نہیں ہے؛ لیکن اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ملی اور دینی خدمت کی پاداش میں جو لوگ قید کئے جاتے ہیں، قانونی کاروائی کے ذریعہ انھیں رہائی دلانا کیا گردن چھڑانے میں شامل نہیں ہے، جب کہ یہ بے قصور محروسین غلاموں سے زیادہ تکلیف میں ہیں؟(۱/ ۵۸۷)

قتل اولاد کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

افلاس کی وجہ سے اولاد کے قتل کرنے کو منع کیا گیا ہے، موجودہ زمانہ میں 'مالتھوس' کے نظریہ کے مطابق قتل اولاد کی بدلی ہوئی شکل برتھ کنٹرول کی صورت میں مروج ہے؛ چنانچہ انسانی پیدائش کو روکنے کے لئے مرد وعورت کا نس بندی آپریشن کیا جاتا ہے، جو حمل قرار پاچکا ہو، اس کا اسقاط کرایا جاتا ہے، عارضی منع حمل کے لئے دواؤں کا اور کنڈوم کا استعمال ہوتا ہے، یہ ساری صورتیں اگر اس لئے اختیار کی جائیں کہ پیدا ہونے والے بچوں کی ضروریات کا کیا انتظام ہوگا؟ تو ناجائز ہے۔(۱/ ۴۶۳)

(۱۰) قرآنی بلاغت : قرآنِ کریم مختلف حیثیتوں سے مختلف اعجازی پہلوؤں کا حامل ہے؛ لیکن اس کے اولین مخاطبین کے لحاظ سے اس کا بلاغی اعجاز سب سے اہم ہے، قرآن کریم بلاغت کے اس اعلیٰ معیار پر ہے کہ انسانی عقل اس جیسا نمونہ پیش کرنے سے عاجز وقاصر ہے، مولانا نے یہ تفسیر گو اُردو زبان میں لکھی ہے؛ لیکن آیات

کی توضیح اس انداز سے کی ہے کہ قرآن کی بلاغت پر بھی روشنی پڑتی ہے، جیسا کہ: ''هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُن ''(البقرۃ:۱۸۷) کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا تحریر فرماتے ہیں :

> لباس سے بڑھ کر انسان کا کوئی راز دار نہیں ہوتا، انسان کا پورا وجود لباس کے سامنے بے لباس ہوتا ہے اور یہی لباس ہے، جو سردی وگرمی سے انسان کی حفاظت کرتا ہے، میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لئے لباس کہہ کر اس طرف اشارہ ہے کہ ان کو ایک دوسرے کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے راز کا امین اور مشکل وقتوں میں ایک دوسرے کا محافظ ومددگار رہنا چاہئے۔(۱/۱۷۷)

(۱۱) نکتہ سنجی : اس تفسیری حاشیہ کا دامن نکات کے گل ولالہ سے بھرا ہوا ہے، جو مولانا کے اخاذ ذہن، نکتہ سنج طبیعت اور نظر کی دقت کا غماز ہے، چند مثالیں پیش خدمت ہیں :

> سورۂ انعام کی آیت: ۸۴-۸۶ میں یہ بات آئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں بہت سے انبیاء آئے، ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام بھی شمار کیا گیا ہے، مولانا نے اس سے جو نکتہ اخذ کیا ہے، ملاحظہ ہو :
>
> اس سے معلوم ہوا کہ بیٹی سے جو خاندان چلتا ہے، وہ بھی انسان کی ذریت میں شامل ہوتا ہے اور یہ بھی ایک خاندانی نسبت ہوتی ہے؛ اسی لئے حضرت فاطمہؓ کی اولاد سے رسول اللہ ﷺ کا خاندانی سلسلہ چلا ہے۔(۱/۴۳۹)

سورۂ اعراف کی آیت: ''وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ ''(اعراف:۱۵۹) سے مولانا نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ بگڑی ہوئی قوم میں کچھ اچھے لوگ بھی ہوں تو ان کی اچھائی کا اعتراف کرنا چاہئے، مولانا لکھتے ہیں :

> اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی گروہ میں کچھ برائی ہو اور وہاں کچھ اچھے لوگ بھی موجود ہوں تو اچھے لوگوں کی اچھائی کا بھی اعتراف کرنا چاہئے۔(۱/۵۱۶)

(۱۲) مثال کے ذریعہ توضیح : کسی بھی بات کو سمجھانے میں مثالوں کو بہت اہمیت ہوتی ہے، مثالیں مفہوم کی پیچیدگی کو سلجھاتی ہیں اور مشکل مضمون کو آسان کرتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن وحدیث میں مثالوں کے ذریعہ تفہیم کو بہت اہمیت دی گئی ہے، اس تفسیر میں بھی تفہیم وتعلیم کے اس اُصول کو اپنایا گیا ہے اور مفاہیم ومضامین کو مثالوں کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے، مثلاً خبیث وطیب کے برابر نہ ہونے کا مطلب سمجھاتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں :

> ہیرے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا پتھر کی ایک چٹان سے بھی زیادہ قیمتی ہوتا ہے، صرف کثرت اور قلت سے ان کی قیمت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔(۱/۴۰۱)

حسبِ ضرورت سائنسی ایجادات سے بھی مثالیں پیش کی گئی ہیں؛ تاکہ جدید ذہن کے لئے سمجھنا آسان ہو، جیسا کہ نامۂ اعمال میں ہر چھوٹے بڑے عمل کے درج ہونے کو مثال کے ذریعہ یوں سمجھایا گیا ہے :

> نامۂ اعمال میں انسان کے ہر چھوٹے بڑے عمل کا ریکارڈ موجود ہوگا، اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ نامۂ اعمال مقدار کے اعتبار سے اتنا چھوٹا ہو کہ لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے؛ لیکن اس کی محفوظ کرنے کی صلاحیت اتنی زیادہ ہو کہ زندگی کی تمام چھوٹی بڑی باتیں اس میں موجود ہوں، انسان کا دماغ چند تولہ کا ہے، اس کا ایک مختصر سا حصہ حافظہ ہے اور اسی میں ساٹھ سال، ستر سال کے تمام واقعات، ہزاروں لوگوں کے نام، بے شمار کتابوں کے مضامین وغیرہ محفوظ ہوتے ہیں تو خالق کائنات کے لئے نامۂ اعمال کو وجود بخشنا کیا مشکل ہے؟ پھر کمپیوٹر کی ایجاد کے بعد اس کا سمجھنا اور بھی آسان ہو گیا، ایک معمولی سی چپ (Chip) میں اربوں کھربوں صفحات، صورتیں اور واقعات محفوظ ہو جاتے ہیں۔(۱/۸۵۸)

(۱۳) اُصولِ دعوت : دعوت اس اُمت کا بنیادی مقصد ہے، صحابی رسول حضرت ربعی بن عامرؓ نے رستم جیسے سپہ سالار کے دربار میں اس کا برملا اظہار کیا تھا کہ: ''الله ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد إلى عبادة الله وحده'' کہ اللہ نے ہمیں اس لئے مبعوث کیا ہے کہ ہم اللہ کی منشا کے مطابق اس کے بندوں کو بندوں کی پرستش سے نکال کر ایک اللہ کی عبادت کی طرف لائیں، حضرت الاستاذ مولانا رحمانی کا سینہ جذبۂ دعوت سے لبریز ہے، مولانا کا قلم اپنے اندر فقیہانہ تعمق، ادیبانہ حلاوت، قائدانہ بصیرت کے ساتھ ساتھ داعیانہ تڑپ وافر مقدار میں رکھتا ہے، مولانا کی تمام تحریروں میں یہ رنگ غالب نظر آتا ہے؛ کیوں نہ ہو کہ یہ صبغۃ اللہ ہے: ''ومن أحسن من الله صبغة'' زیر تبصرہ تفسیر میں دعوت کے اُصول، داعی کی صفات، دعوت کی اہمیت اور مدعو سے تعلقات وغیرہ پر اتنا کچھ مواد موجود ہے کہ اس کے لئے مستقل مقالہ کی ضرورت ہے، یہاں بہ طور مثال چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں :

> ● اس سے دعوت دین کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے غیر مسلم بھائیوں کو موقع دینا چاہئے کہ وہ ان کے درمیان آکر رہیں اور دین کو سمجھیں کہ شاید یہ اِن کے لئے ہدایت کا باعث ہو، اس آیت میں خاص طور پر کلام اللہ کے سننے کا ذکر کیا گیا ہے؛ کیوں کہ اس زمانہ میں علم کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ سننا اور سنانا تھا، وہ پریس اور لٹریچر کا دور نہیں تھا، ہمارے عہد کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی لٹریچر اور قرآن مجید کا ترجمہ غیر مسلم بھائیوں تک پہنچایا جائے۔(۱/۵۶۴)

● اس سے جہاں یہ بات معلوم ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ کا ذکر توراۃ وانجیل میں موجود ہے، وہیں اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اگر توحید، رسالت، نبوت محمدی اور آخرت کا ذکر دوسری مذہبی کتابوں میں ہو تو ان کو ماننے والوں پر حجت پوری کرنے کے لئے دعوت دین کے مقصد کے تحت ان کا حوالہ دیا جاسکتا ہے اور اس سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ جو بات مخاطب کے نزدیک تسلیم شدہ ہو، اُسے قبول کرانا آسان ہوتا ہے۔(۱/۵۱۸)

● گویا اس میں داعیانِ حق کے لئے پیغام ہے کہ دعوتِ دین کی راہ ایسی نہیں، جس میں پھولوں کی سیج بچھائی جائے اور لوگ خوش آمدید کہیں؛ بلکہ اس راہ کے مسافر کو اپنے آپ کو تکلیف دہ باتوں کے سننے اور اہانت آمیز سلوک کو برداشت کرنے کے لئے تیار رکھنا چاہئے۔(۱/۴۱۵)

(۱۴) حدیث وقرآن کے درمیان تطبیق : حدیث نبوی قرآن کریم کا بیان اور اس کی تفسیر ہے، اس لئے دونوں میں حقیقتاً کوئی تعارض نہیں ہوسکتا؛ لیکن عقلِ کوتاہ بیں کو بعض مقامات پر بہ ظاہر تعارض نظر آجاتا ہے، اس تفسیر میں اس طرح کے تعارض کو دُور کرنے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے، مثلاً سورہ توبہ کی آیت: ۱۲ میں یہ حکم ہے کہ دین میں طعن کرنے والوں سے قتال کرو، یہ آیت اس حدیث سے ٹکراتی ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنونجران سے مباحثہ کیا اور بنونجران نے اسلام پر اعتراضات بھی کئے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں سے قتال نہیں کیا، مولانا دونوں کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

''دین میں طعن کرنا'' سے مراد اسلام پر اہانت آمیز اعتراض کرنا ہے، اگر اسلام کے کسی حکم پر سنجیدہ عقلی تنقید ہو اور یہ تنقید مہذب الفاظ میں ہو تو اس سے قتل کا حکم متعلق نہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا بنونجران سے مباحثہ ہوا، انھوں نے اسلام پر اعتراضات بھی کئے اور آپ ﷺ نے ان کو مطمئن کرنے کی کوشش فرمائی۔(۱/۵۶۶)

(۱۵) واقعات کا تجزیہ : قرآن کریم نے جن واقعات کا تذکرہ کیا ہے اس تفسیر میں ان واقعات کا بصیرت مندانہ تجزیہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے؛ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں :

اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ کسی قوم پر عذاب آنے سے پہلے انھیں دو طرح کی حالتوں سے دوچار کیا جاتا ہے، تکلیف اور تنگی وعسرت سے؛ تاکہ ان میں جھکاؤ پیدا ہو اور وہ خدا کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کردیں، اور راحت وآسائش کا دروازہ کھول کر؛

تا کہ ان میں شکر کا جذبہ پیدا ہو اور شاید اس طرح وہ اپنے مالک کی طرف متوجہ ہوں؛ لیکن جب یہ دونوں تدبیریں کسی قوم کے ضمیر کو بیدار کرنے اور انھیں راہ راست پر لانے میں ناکام ہوجاتی ہیں تو اب ان پر اللہ کا عذاب مسلط کر دیا جاتا ہے اور اس وقت حسرت وافسوس کے سوا کوئی اور چیز ان کے پاس باقی نہیں رہتی۔(۱/ ۴۲۳)

(۱۶) مستند ومتداول مصادر وماٰخذ سے استفادہ : ایک کامیاب و ماہر محقق کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ معلومات کو ثانوی ذرائع سے لینے کے بجائے براہ راست مستند ومعتبر مصادر ومراجع سے حاصل کرتا ہے اور پوری تحقیق کے بعد ہی کوئی بات قیدِ قلم میں لاتا ہے، اس تفسیر میں بھی یہ کوشش کی گئی ہے کہ ہر بات پوری تحقیق کے بعد لکھی جائے اور مکمل جانچ پڑتال کے بعد زینتِ قرطاس بنائی جائے؛ اس لئے از اول تا آخر مستند مصادر ومعتبر مراجع سے استفادہ کا التزام کیا گیا ہے۔

(۱۷) حوالہ جات کی نشاندہی : اس تفسیر میں نہ صرف یہ کہ مستند مصادر وماٰخذ سے استفادہ کیا گیا ہے؛ بلکہ زیادہ تر حسبِ موقع ان مصادر کے حوالہ جات بھی درج کئے گئے ہیں؛ تا کہ تشنگانِ علم اور خوگرانِ تحقیق اصل منبع سے سیرابی حاصل کرسکیں۔

(۱۸) سورتوں کی وجہ تسمیہ اور بیان فضائل : ہر سورت کے شروع میں ایک وضاحتی نوٹ بڑھایا گیا ہے، جس میں سورت کا تعارف کرایا گیا ہے، اس کی وجہ تسمیہ ذکر کی گئی ہے اور اس کے مستند فضائل مختصر طور پر ذکر کئے گئے ہیں، جو کہ حضرت مولانا محمد قاسم مظفر پوری کے بقول اُردو تفاسیر میں ایک ابداعی عمل ہے۔

(۱۹) واقعات وقصص سے حصولِ عبرت وموعظت : قرآن میں واقعات وقصص کیوں بیان کئے گئے ہیں، اس کا جواب خود قرآن نے دیا ہے: ''لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ''(یوسف:۱۱۱)(یقیناً ان کی داستانوں میں سمجھداروں کے لئے عبرت کا سامان ہیں)؛ لہٰذا ایک باشعور مفسر کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان واقعات وقصص میں عبرت وموعظت کے جو پہلو ہیں، ان کی وضاحت کرے اور ان سے ملنے والے سبق پر روشنی ڈالے، مولانا نے یہ فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا ہے اور مرتب ودل نشیں انداز میں واقعات وقصص سے ماخوذ دروس عبرت واحکامِ شریعت کو ذکر کیا ہے، مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد مولانا نے جو عبرت وموعظت کے مختلف پہلو اور احکامِ شریعت کے متعدد نکات ذکر کئے ہیں، ان میں سے چند کو یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں :

● عزیز مصر کے مکان کو قرآن نے اس کی بیوی کا گھر ''بَيْتِهَا'' قرار دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بیوی کی حیثیت صرف ایک خادمہ کی نہیں؛ بلکہ اپنے شوہر کے گھر کی مالکن اور انچارج کی ہوتی ہے۔

● حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی بیوی کو منع کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ تمہارے شوہر نے میرے ساتھ بہتر سلوک کیا ہے؛ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی مسلمان احسان کرے یا غیر مسلم، کسی نیک و پارسا شخص نے احسان کا معاملہ کیا ہو یا گنہگار شخص نے، بہرحال محسن کا پاس ولحاظ رکھنا چاہئے۔

● یہ بھی معلوم ہوا کہ عزم وارادے کے بغیر غیر اختیاری طور پر دل میں کسی برائی کا خیال آجائے ؛ لیکن انسان اس کے ارتکاب سے اپنے آپ کو بچالے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا تو یہ گناہ نہیں ہے؛ کیوں کہ گناہ وہ ہے جس میں انسان کے ارادہ واختیار کو دخل ہو۔

● اگلے دامن یا پچھلے دامن کے پھٹے ہونے کو جو مجرم کی پہچان کی علامت قرار دیا گیا ہے، اس سے یہ حکم مستنبط ہوا کہ کسی معاملے کے ثابت ہونے میں قرائن کو بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور فیصلے تک پہنچنے میں اس سے مدد لی جاسکتی ہے۔

● عزیز مصر کی بیوی نے جیل کی سزا کا مطالبہ کیا، معلوم ہوا کہ مصر متمدن ملک تھا اور وہاں مجرموں کی سزا کے لئے جیل خانہ کا نظام موجود تھا۔

● عزیز مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا کہ آپ اس کا چرچا نہ کیجئے اور قرآن نے کسی تبصرہ کے بغیر اسے نقل کیا، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر کوئی بُرائی ہوجائے تو کوشش کرنی چاہئے کہ اس کا زیادہ چرچا نہ ہو؛ کیوں کہ برائی کے ذکر سے بھی برائی پھیلتی ہے۔

● عزیز مصر نے اپنی بیوی کو استغفار کا حکم دیا، اس سے معلوم ہوا کہ جو گناہ سزا کے درجہ کو نہ پہنچا ہو، یا پہنچ گیا ہو؛ لیکن سزا جاری کرنے کا موقف نہ ہو یا اس کی برائی لوگوں پر ظاہر نہ ہو تو اس کو خاص طور پر استغفار کا اہتمام کرنا چاہئے؛ کیوں کہ اس کے لئے گناہ کی تلافی کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ (١/٦٩٧)

(٢٠) اسرائیلی روایات سے اجتناب : اسرائیلی روایات چوں کہ تحریف وتصحیف کے دستِ تصرف سے گذر کر ہم تک پہنچی ہیں؛ اس لئے وہ ناقابل اعتماد ہیں؛ لہٰذا آیاتِ قرآنیہ کی تشریح وتوضیح میں ان روایات سے اعتنا برتنا مناسب نہیں ہے، اسی بنا پر اس تفسیر میں اسرائیلی روایات سے اجتناب کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

(۲۱) سائنسی حقائق کی توضیح : جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور عصری علوم کے طلبہ کو عام طور سے یہ شکایت رہتی ہے کہ قرآن کریم کی جو آیتیں سائنس سے تعلق رکھتی ہیں، ان کی تفسیر کے دوران معاصر مفسرین سائنسی حقائق کی طرف خاطر خواہ التفات نہیں کرتے ہیں، جب کہ یہ آیتیں موجودہ سائنسی دور کے لئے علمی و سائنسی اعجاز کا ایک واضح اور اہم پہلو اپنے اندر رکھتی ہیں، مولانا نے اپنی اس تفسیر میں ان سائنسی حقائق کی توضیح کی طرف مناسب توجہ دی ہے اور ان آیات سے قرآن کے اعجاز کو ثابت کیا ہے؛ چنانچہ سورہ قیامہ میں جہاں پوروں کو درست کرنے کی بات آئی ہے، اس کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں :

> اس میں ایک لطیف نکتہ وہ ہے جس کا موجودہ سائنس نے انکشاف کیا ہے کہ جیسے انسان کے چہروں، اس کی آوازوں، اس کی چال ڈھال وغیرہ میں امتیاز رکھا گیا ہے اور ان میں ہر ایک دوسرے سے مختلف ہے، اسی طرح انسان کے بہت سے بیرونی واندرونی اعضاء باہم ممتاز ہیں، ان ہی میں انگلیوں کے پوروں کے نشانات ہیں؛ اس لئے جو لوگ لکھنے پر قادر نہ ہوں، ان کے انگوٹھے کے نشان لئے جاتے ہیں اور اب امیگریشن کے لئے بھی پانچوں انگلیوں کے نشانات کو محفوظ کیا جاتا ہے، ایک طرف اللہ کی قدرت دیکھئے کہ اس نے کیسا کارخانۂ تخلیق بنایا ہے، جس میں ڈھلنے والی ہر شئے دوسرے سے جدا ہے؟ دوسرے: اس بات پر غور کیجئے کہ کیا اس کے بعد بھی قرآن کی حقانیت پر کوئی اور دلیل چاہئے کہ اس نے تقریباً پندرہ سو سال پہلے انسانیت کو ان حقائق سے باخبر کیا ہے، جن کا سائنس کی غیر معمولی ترقیات کے بعد آج انکشاف ہوا ہے؟ (۸۱۴/۲)

(۲۲) خلافِ شریعت رسوم پر نکیر : قرآن کی تعلیمات معاشرے کی صلاح وفلاح کی ضامن ہیں، ان تعلیمات سے سرِ مو انحراف معاشرے کی تباہی و بربادی کا بنیادی سبب ہے، ضروری ہے کہ معاشرے کو خلافِ شریعت رسوم سے نجات دلائی جائے اور قرآن کی اصل تعلیمات کی طرف لوٹایا جائے، اسی بنا پر اس تفسیر میں خلافِ شریعت رسوم ورواج پر نکیر کرنے میں کسی طرح کی مصلحت کو راہ نہیں دی گئی ہے، مثلاً نماز کے بعد جہری دُعا کے رواج کے بارے میں مولانا رقم فرماتے ہیں :

> آج کل ہندو پاک کی مسجدوں میں نمازوں کے بعد زور زور سے دُعاء کرنے کا جو رواج ہوگیا ہے، یہ مسنون طریقہ کے خلاف ہے اور اس میں دُعاء کی حقیقی روح پیدا نہیں ہوتی؛ بلکہ رسمی طور پر امام دُعاء کے کچھ مقررہ الفاظ پڑھتا ہے اور مقتدی حضرات اس پر ''آمین'' کہتے جاتے ہیں۔ (۴۸۸/۱)

(۲۳) عربی الفاظ شناسی : ایک باکمال مفسر کے لئے ضروری ہے کہ عربی زبان پر اس کو مکمل دسترس حاصل ہو، وہ عربی الفاظ کی باریکی، معانی کی گہرائی اور مفاہیم کی گیرائی سے واقف ہو؛ تاکہ منشاء خداوندی کو صحیح طور پر سمجھ کر صحیح طور پر دوسروں کو سمجھا سکے، اس کے نمونے مولانا کی تفسیر میں جابجا موجود ہیں؛ مثلاً ''اُمی'' کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> اُمّی اصل میں (اُم) ماں سے ماخوذ ہے، یعنی ایسا شخص جو پڑھا لکھا نہ ہو؛ بلکہ وہ ویسا ہی ہو جیسا کہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو؛ چنانچہ اُمّی ایسے شخص کو کہتے ہیں جو لکھنا اور لکھی ہوئی چیز کو پڑھنا نہ جانتا ہو، (مفاتیح الغیب: ۳۰۶/۷) البتہ اُمی کا ترجمہ ''جاہل'' کے لفظ سے نہیں کیا جاسکتا؛ کیوں کہ علم کا ذریعہ صرف تحریر ہی نہیں ہے، پہلے زمانہ میں علم سینہ بسینہ ایک دوسرے تک پہنچایا جاتا تھا۔ (۵۱۷/۱)

(۲۴) عربی گرامر کا لحاظ : قرآنی آیتوں کو سمجھنے، ان کے جملوں اور ترکیبوں کے درست مفہوم تک پہنچنے میں عربی گرامر کو پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے، ورنہ بات کچھ کی کچھ ہوجائے گی، اس تفسیر میں اس کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ آیات کی تفسیر عربی گرامر کے دائرے سے باہر نہیں ہونی چاہئے اور مختلف مواقع پر گرامر کے اعتبار سے آیتوں کی توضیح بھی پیش کی گئی ہے؛ چنانچہ ''عالم الغیب'' کی توضیح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :

> عربی گرامر کے لحاظ سے عالم الغیب پر الف لام 'استغراق' کے لئے ہے، یعنی عالم الغیب کے معنی ہیں: غیب کی تمام باتوں کو جاننے والا، یہ صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔ (۷۹۵/۲)

(۲۵) عربی محاورات وتعبیرات کی رعایت : ہر زبان کے اپنے محاورات اور اپنی تعبیرات ہوا کرتی ہیں، ان کا لفظی ترجمہ کرنے سے بات واضح نہیں ہو پاتی ہے؛ بلکہ کبھی مضحکہ خیز بن جاتی ہے ؛ لہٰذا مفسر کے لئے ضروری ہے کہ وہ عربی محاورات وتعبیرات کی رعایت ملحوظ رکھے، مولانا نے اس پہلو کو بخوبی ملحوظ رکھا ہے اور مختلف مقامات پر عربی محاورہ یا عربی تعبیر کی توضیح کی ہے، سورۂ قلم کی آیت ''یوم یکشف عن ساق'' کے حاشیہ میں ہے :

> عربی زبان میں کسی چیز کی شدت کو پنڈلی کھولنے سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسے گھمسان کی لڑائی شروع ہوجاتی ہے تو کہا جاتا ہے: ''شمرت الحرب عن ساقھا'' (المعجم الوسیط: ۴۹۳/۱) تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ان کے شاگردوں سے منقول ہے کہ یہاں روز قیامت کی شدت مراد ہے، یعنی جب قیامت کے دن کا کرب اپنے شباب پر

پہنچ جائے گا تو لوگوں کو حکم ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کریں، تو وہی لوگ سجدہ کرسکیں گے،
جو حقیقت میں اہل ایمان تھے، (تفسیر قرطبی: ۲۴۹/۱۸)۔ (۷۶۸/۲)

(۲۶) عصمت انبیاء کالحاظ : قرآنی آیات کی تفسیر میں عصمت انبیاء کا مسئلہ نہایت نازک مسئلہ ہے، ذراسی بے احتیاطی سے ان قدسی صفات و پاک انفاس کی شان میں گستاخی ہوجاتی ہے، یہ مسئلہ نازک اس لئے بھی ہے کہ انبیاء کا تذکرہ خدا نے اس حیثیت سے کیا ہے کہ وہ ان انبیاء کا بھی خدا ہے؛ لہٰذا وہ الفاظ میں سختی اور اظہار بیان میں کرختگی اختیار کرسکتا ہے، اسے حق ہے کہ وہ سخت لب ولہجہ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کرے؛ لیکن اگر مفسر بھی یہی لب ولہجہ اختیار کرلے تو پھر قلم کی جنبش سے قابل سرزنش لغزش کے سرزد ہونے کا امکان رہتا ہے، مولانا نے سلف صالحین کے منہج کے مطابق عصمت انبیاء کی رعایت کرتے ہوئے پوری احتیاط کے ساتھ اس طرح تفسیر کی ہے کہ خدا کے کلام کی ترجمانی بھی ہوجائے اور انبیا کا احترام بھی باقی رہے؛ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں رقمطراز ہیں :

> یعنی اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا اشتیاق اور خوشنودی حاصل کرنے کا بے پناہ جذبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جلدی جلدی بارگاہ الٰہی میں لے گیا، دوسری طرف اپنی قوم سے اس لئے اطمینان تھا کہ ان کے درمیان حضرت ہارون علیہ السلام کو چھوڑ کر گئے تھے، اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جلد بازی یا اُمت کی فکر سے لاپرواہی کی کوئی بات نہیں تھی۔ (۸۱/۲)

(۲۷) انبیاء کرام کی طرف سے دفاع : ترجمہ وتفسیر میں نہ صرف یہ کہ انبیاء کی عصمت کا لحاظ رکھا گیا ہے؛ بلکہ اگر کہیں انبیاء کی عصمت پر حرف آرہا ہو تو اس کا معقول دفاع بھی کیا ہے؛ چنانچہ حضرت یونس کی طرف سے دفاع کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں :

> اس لئے یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے فریضہ رسالت کو پوری طرح ادا نہیں کیا؛ اس لئے اللہ تعالیٰ کی سنت کے برخلاف عذاب آنے کے بعد پھر ٹل گیا، حقیقت یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم اللہ کا عذاب آنے سے پہلے ہی ایمان لے آئی؛ اسی لئے ان کا ایمان ان کے لئے نافع ہوا۔ (۶۴۹/۱)

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کا دفاع کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> غالباً حضرت نوح علیہ السلام کا یہ لڑکا منافق تھا، کھلے طور پر کفر میں مبتلا نہیں تھا، عدم واقفیت کی بنا پر آپ نے اللہ تعالیٰ سے ان کے لئے دُعاء کی تھی؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے

فرمایا کہ تم کو جس بات کا علم نہیں ہے، اس کے بارے میں سوال نہ کرو ''فَلاَ تَسْئَلْنِ مَالَيْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ ''۔(۱/ ۶۶۷)

(۲۸) فقہی مباحث : یوں تو اس تفسیر میں طویل بحثوں سے اجتناب کیا گیا ہے؛ البتہ حسبِ ضرورت مختصر اور جامع انداز میں فقہی مباحث کو جگہ دی گئی، مثلاً: ''متروک التسمیہ'' یعنی جس جانور پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اس کے بارے میں لکھتے ہیں :

> امام مالکؒ کے نزدیک اگر بھول کر بھی اللہ کا نام نہ لے تب بھی ذبیحہ حرام ہوجاتا ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جان بوجھ کر اللہ کا نام لینا چھوڑ دے تب جانور حرام ہوتا ہے، اگر بھول کر اللہ کا نام نہ لے سکا تو ذبیحہ حرام نہیں ہوگا؛ کیوں کہ ایک تو شریعت کے بنیادی اُصول میں سے یہ بھی ہے کہ بھول میں ہونے والا کام بہت سی صورتوں میں قابل عفو ہوتا ہے، جیسے روزہ میں بھول کر کھالے تو روزہ نہیں ٹوٹتا، دوسرے: اللہ تعالیٰ نے اسی سورت کی آیت نمبر: ۱۲۱ میں اللہ کا نام نہ لئے ہوئے ذبیحہ کے کھانے کو فسق قرار دیا ہے اور فسق یعنی گناہ وہی عمل ہوتا ہے، جس میں قصد وارادہ کا دخل ہو، بھول کر جو کام کیا جائے وہ بالاتفاق فسق نہیں ہے، یہی نقطۂ نظر مشہور روایت کے مطابق امام احمدؒ کا بھی ہے؛ البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک اصل مقصود یہ ہے کہ جانور پر غیر اللہ کا نام نہ لیا جائے، اگر غیر اللہ کا نام لیا جائے تب جانور حرام ہوگا، رہ گیا مسلمان ذبح کرنے والے کا ذبیحہ پر 'بسم اللہ' کہنا تو یہ سنت ہے، اگر قصداً نہ کہے تب بھی ذبیحہ حرام نہیں ہوگا (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۷/ ۷۶-۷۵) ـــ اس میں شبہ نہیں کہ اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا نقطۂ نظر قرآن وحدیث سے زیادہ ہم آہنگ بھی ہے اور اعتدال پر مبنی بھی، واللہ اعلم۔ (۱/ ۴۵۰)

(۲۹) امکانی اعتراض کا جواب : قرآن کریم ''لَا رَيْبَ فِيْهِ''، اس میں نہ کسی طرح کا لفظی تعارض ہے اور نہ ہی کسی قسم کا معنوی تناقض؛ البتہ کسی جگہ کم فہمی یا کج فہمی کی وجہ سے کسی کو کوئی اعتراض ہوسکتا ہے تو ایسے امکانی اعتراض کا بھی اس تفسیر میں جواب دیا گیا ہے، مثلاً سورۂ اعراف میں کہا گیا ہے کہ ''اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ''(الاعراف: ۴۳) یعنی تمہارے اعمال کی وجہ سے تمہیں جنت دی گئی ہے، یہاں کسی کو اعتراض ہوسکتا ہے کہ نعوذ باللہ اللہ کسی کو اس کے نیک اعمال کی وجہ سے جنت دینے پر مجبور ہیں، مولانا یہ اعتراض دفع کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

اصل میں تو جنت میں داخل ہونا اللہ کے فضل وکرم سے ہوگا؛ لیکن انسان کی نیکیوں ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا فضل حاصل ہوتا ہے؛ اس لئے فرمایا جائے گا کہ تمہارے اعمال کی وجہ سے تم جنت میں داخل کئے گئے ہو۔(۱/ ۴۸۴)

(۳۰) انسانی نفسیات کی وضاحت : انسانوں کو پیدا کرنے والا بھی خدا ہے اور قرآن نازل کرنے والا بھی خدا ہے، انسانی نفسیات کو خدا سے زیادہ کون جان سکتا ہے کہ وہی نفس کا بھی خالق ہے اور نفسیات کا بھی؛ اسی لئے قرآنی آیات میں انسانی نفسیات ملحوظ رکھی گئی ہیں، اس تفسیر میں جا بجا انسانی نفسیات کی وضاحت کی گئی ہے؛ تاکہ ارشاد ربانی کو سمجھنا آسان ہو، سورہ توبہ کی آیت ۶۶ کے حاشیہ میں ہے :

انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ جس چیز کو دیکھتا ہے، اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتا؛ اس لئے مادی طاقت کا اس درجہ تفاوت کہ ایک طرف ایک آدمی کھڑا ہے اور دوسری طرف سو آدمی ہے، یقیناً انسان کے لئے حوصلہ شکن ثابت ہوتا ہے، اس نفسیاتی کمزوری کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے حکم میں آسانی پیدا فرمادی کہ کم سے کم اگر مسلمانوں اور کافروں کا مقابلہ سو اور دوسو کا ہو تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ مقابلہ پر جمے رہیں اور تعداد کی کمی کو خاطر میں نہ لائیں۔(۱/ ۵۵۳)

(۳۱) مناسب عقلی توجیہ : متعدد آیات کی تفسیر میں مناسب عقلی توجیہ پیش کی گئی ہے، جس کی وجہ سے جدید ذہن کے حامل افراد کے لئے آیات کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے؛ البتہ عقلی توجیہ میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ وہ نصوصِ شرعیہ سے متصادم نہ ہو؛ چنانچہ شیطانوں کو ستاروں سے مارنے کی بابت مولانا نے عقلی توجیہ یوں پیش کی ہے :

شیطانوں کو مار بھگانے کا ذریعہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ ستارے ہی شیطانوں پر پھینک دیئے جاتے ہیں؛ بلکہ ان ستاروں میں وقتاً فوقتاً انفجار پیدا ہوتا رہتا ہے، جس سے شہاب ثاقب نکل کر فضا میں آجاتے ہیں اور یہی شیطان کو بھگانے کا ذریعہ اور وہاں تک پہنچنے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔(۲/ ۷۵۶)

آسمان کے پھٹ پڑنے اور پھسپھسا ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں :

اس کی صورت شاید یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے تحت وہ نظام کشش ختم ہو جائے، جو تمام سیاروں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھے ہوئے ہے اور تمام سیارے درہم برہم ہو جائیں۔(۲/ ۷۷۴)

(۳۲) اسلامی مزاج کی توضیح : اسلامی مزاج و مذاق سے شناسائی و آشنائی گہرے مطالعہ اور لمبی ممارست کے بعد حاصل ہوتی ہے، بفضل ایزدی مولانا کو اسلامی مزاج شناسی کا وافر حصہ ملا ہے اور مولانا نے اس تفسیر میں مختلف موضوعات کے تحت اسلامی مزاج کی توضیح کی ہے، مثلاً مال کمانے کے تعلق سے اسلام کا جو مثبت ومعتدل مزاج ہے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

> اللہ تعالیٰ نے مسافروں کے دو طبقوں کا ذکر فرمایا ہے، ایک وہ جن کا سفر کسبِ معاش کے لئے ہو، دوسرا وہ جس کا سفر جہاد کے لئے ہو، گویا کسبِ معاش کا سفر اور جہاد کا سفر دونوں کو ایک درجہ میں رکھا گیا ہے، اس سے اسلام کی نظر میں کسبِ معاش کی فضیلت واہمیت معلوم ہوتی ہے۔ (۸۰۲/۲)

(۳۳) حِکم واسرار کی نشاندہی : قرآن کریم حکمتوں کا منبع ہے، اس کے احکام میں علتیں مستور ہیں اور اس کے فرمودات حِکم واسرار سے معمور ہیں، اس تفسیر میں قرآنی آیات کے حکم واسرار بتانے سے بھی اعتنا کیا گیا ہے، مثلاً سورۂ توبہ کی آیت: ''يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ'' میں پیشانی، پہلو اور پشت کے تذکرہ کرنے کی حکمت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں :

> بعض اہل علم نے یہ نکتہ بھی لکھا ہے کہ جب انسان کسی محتاج اور مانگنے والے کو دیکھتا ہے تو پہلے اس کی پیشانی پر شکن آجاتی ہے اور چہرے پر ناگواری ظاہر ہوتی ہے، پھر جب اس سے سوال کرتا ہے تو اپنا پہلو بدل لیتا ہے اور جب سوال کرنے میں زیادہ الحاح وخوشامد کرتا ہے تو پھر بالکل ہی مڑ جاتا ہے اور اپنی پیٹھ اس کی طرف کردیتا ہے ؛ اس لئے انسان کی معصیت کے لحاظ سے آخرت میں اس کو سزا دی جائے گی، (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۱۲۹/۸)۔ (۵۷۷/۱)

(۳۴) مقامِ صحابہ کا احترام : صحابہ معصوم نہیں ؛ البتہ مغفور ضرور ہیں، انبیاء کے بعد سب سے افضل و برتر ہیں، ان کی شان میں ادنیٰ گستاخی بھی روا نہیں ہے، اسی بنا پر اس تفسیر میں مقامِ صحابہ کا پورا احترام ملحوظ رکھا گیا ہے، مولانا نے پوری وضاحت کے ساتھ کہا ہے کہ صحابہ کی لغزشیں بھی اُسوہ ہیں، مولانا کے الفاظ میں :

> اس آیت سے ایک تو صحابہؓ کی عظمت واضح ہوتی ہے کہ اگر انسان ہونے کی حیثیت سے ان سے کوئی غلطی بھی ہوجاتی تو فوراً انھیں ندامت اور شرمساری ہوتی اور سچی پکی توبہ فرماتے ؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ جیسے صحابہؓ کی نیکیاں اُمت کے لئے اُسوہ ہیں،

اسی طرح ان کی لغزشیں بھی اُسوہ ہیں کہ اگر کوئی مسلمان اللہ کی نافرمانی کر بیٹھے تو اس کے بعد اس کا کیا رویہ ہونا چاہئے ، دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ سے جو بھول چوک ہوتی تھی ، توبہ اور رسول اللہ ﷺ کی دُعاء کے ذریعہ وہ اللہ کی طرف سے معاف کردی جاتی تھی ۔ (۱/ ۶۰۳)

(۳۵) زندگی گزارنے کیلئے ہدایات : قرآن کریم کی ہدایت زندگی کے ہر گوشے اور عمل کے ہر شعبے میں ہے، وہ زندگی کا سلیقہ سکھاتا ہے، جینے کا طریقہ بتاتا ہے، زیر تذکرہ تفسیر میں قرآنی آیات کی روشنی میں زندگی گزارنے کے مختلف اُصول بتائے گئے ہیں، جن کا تعلق زندگی کے مختلف گوشوں سے ہے، سماجی زندگی کے تعلق سے یہ ہدایات ملاحظہ ہوں :

اس آیت سے معلوم ہوا کہ آنے والے مہمان کو چاہئے کہ میزبان کو سلام کرے اور سلام میں اس کو پہل کرنی چاہئے ، دوسرے : میزبان کو سلام کا جواب دینا چاہئے ، تیسرے : میزبان کو آنے والے شخص کی ضیافت کرنی چاہئے ، یہاں تک کہ مشہور فقیہ ''لَیث بن سعد'' کے نزدیک تو مہمان نوازی واجب ہے، چوتھے : جب مہمان آئے تو کھانا پیش کرنے میں جلدی کرنی چاہئے اور جو بے تکلف پیش کرسکیں، کرنا چاہئے ، پانچویں : جب کھانا پیش کیا جائے تو مہمان کو چاہئے کہ جلدی اور رغبت ظاہر کرتے ہوئے کھانا کھائے ؛ تاکہ میزبان کے لئے خوشی کا باعث ہو، چھٹے : مہمان نوازی کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ میزبان نظر گڑائے بغیر دیکھتا رہے کہ مہمان کھاتا ہے یا نہیں؟ تاکہ اس کو متوجہ کرسکے، (ملخص از : تفسیر قرطبی : ۹/ ۶۲-۶۵) ۔ (۱/ ۶۷۲)

اسی طرح سیاسی زندگی کی یہ اُصولی ہدایات ملاحظہ ہوں :

اگر مسلمان کسی غیر مسلم ملک میں پھنسے ہوئے ہوں تو مسلمان حکومتوں کا شرعی فریضہ ہے کہ وہ ان مسلمانوں کی مدد کریں، اگر اس غیر مسلم ملک سے کوئی معاہدہ نہیں ہو اور جنگ کی قدرت حاصل ہو تو جنگی کارروائی کرنا بھی ضروری ہے اور اگر ایک دوسرے کے معاملہ میں دخیل نہ ہونے کا کوئی معاہدہ پہلے سے ہو چکا ہے تو اخلاقی دباؤ ڈال کر مظلوم مسلمانوں کی مدد کی جائے ، نہ یہ کہ ان کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے ، جیسا کہ آج کل فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ پڑوسی مسلمان ملکوں کا

حال ہے؛ کیوں کہ پوری دنیا کے مسلمان علاقہ ومکان سے بالاتر ہوکر ایک اکائی ہیں اور ان میں سے ایک فرد پر زیادتی دراصل پوری اُمت کے ساتھ زیادتی ہے۔(۱/ ۵۵۷)

(۳۶)مسلم اقلیت کی رہنمائی : اس تفسیر کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مسلم اقلیتوں (Muslim Minorities) کے لئے بہت واضح رہنمائی کی گئی ہے،اس پہلو سے یہ تفسیر مسلم اقلیتوں اور خاص کر ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بہت اہمیت کی حامل ہے،سورۂ شوریٰ کی آیت:۲۵ کی تفسیر میں مسلم اقلیتوں کے لئے جو رہنمائی کی گئی،وہ قابل ذکر ہے :

اس آیت میں ان مسلمانوں کے لئے بہترین نصیحت کی گئی ہے، جو اکثر غیر مسلم اکثریت کے درمیان رہتے ہیں، یا جو مختلف مذاہب کے ملے جلے سماج میں رہ رہے ہیں،ان کے لئے پہلی نصیحت یہ فرمائی گئی کہ انھیں اسلام کی دعوت وتبلیغ پر پوری توجہ دینی چاہئے اور اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلانا چاہئے ، دوسرے: اپنے دین پر ثابت قدم رہنا چاہئے ،خواہ کیسی ہی آزمائش آجائے ،ان کا قدم لرزنا نہیں چاہئے ، تیسرے: ان کو غیر اسلامی نظریات اور غیر مسلم تہذیب وثقافت کو ہرگز قبول نہ کرنا چاہئے:’’وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ‘‘(المائدۃ:۴۸)، چوتھے: انھیں اپنے سماج میں عدل وانصاف کا نمونہ بننا چاہئے اور ہر حال میں انصاف کا دامن نہ چھوڑنا چاہئے ، پانچویں: جو لوگ دامن ایمان میں نہ آئیں،ان کے خلاف جبر یا شدت کا رویہ نہیں اختیار کرنا چاہئے؛ بلکہ ہمیں اپنے طریقہ پر قائم رہنا چاہئے اور اگر وہ اپنے مذہب پر عمل کرنا چاہیں تو اس میں رکاوٹ نہیں بننا چاہئے:’’لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ‘‘(الشوریٰ:۱۵) چھٹے: سنجیدہ طریقہ پر اسلام کی دعوت ضرور پیش کرنی چاہئے؛ لیکن جو لوگ کٹ حجتی سے کام لیں اور جانتے بوجھتے حق کو قبول نہ کریں تو ان سے بحث میں اُلجھنا نہیں چاہئے؛ کیوں کہ اس سے فائدہ نہیں ہوتا؛ بلکہ اُلٹے نفرت پیدا ہوجاتی ہے:’’لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ‘‘(الشوریٰ:۱۵)—غور کیجئے تو یہ مسلمان اقلیتوں اور غیر مسلم معاشرہ میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے زندگی گزارنے کے بہترین اُصول ہیں۔(۲/ ۴۹۸)

(۳۷) تاریخی شواہد سے وضاحت : اس تفسیر میں حسبِ ضرورت تاریخی شواہد سے آیات کی توضیح وتشریح کی گئی ہے، مثلاً اسلام سے رُوگردانی کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے دوسری قوم لانے کی جو بات کہی ہے، مولانا نے تاریخ کی روشنی میں اس کی توضیح یوں کی ہے :

غور کیجئے کہ حجاز کے اُفق سے اسلام کا سورج طلوع ہوا اور صحابہ کی جاں نثاریوں سے بہت جلد جزیرۃ العرب کے حدود کو پار کر کے دوسرے ملکوں میں داخل ہوگیا، پھر جب عربوں نے عیش وعشرت کا راستہ اختیار کیا اور انھیں اسلام سے زیادہ اپنی حکومتوں کی فکر دامن گیر ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے ایران کے مجوسی النسل نومسلموں سے خدمت لی اور انھیں کے ذریعہ تفسیر وحدیث، فقہ وکلام، تصوف یہاں تک کہ خود عربی زبان وقواعد جیسے اہم علوم پایۂ کمال کو پہنچے، آج جن بلند پایہ محدثین وفقہاء اور مفسرین وصوفیاء کا ذکر ہماری زبانوں پر رہتا ہے، یہ زیادہ تر ایرانی النسل ہی تھے، پھر مختلف ادوار میں ترکوں نے، تاتاریوں نے اور ہندوستان میں بسنے والے مختلف گروہوں نے، نیز مشرقِ بعید انڈونیشیا اور ملیشیا وغیرہ کی اقوام نے اسلام قبول بھی کیا اور مختلف جہتوں سے اسلام کی خدمت بھی کی؛ اس لئے کسی شخص یا گروہ سے اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت لے رہے ہیں تو اسے تکبر سے بچنا اور اللہ سے ڈرنا چاہئے کہ کہیں اسے خدمت دین کے اس اعزاز سے محروم نہ کردیا جائے اور کسی اور گروہ کو اس کے لئے منتخب نہ کرلیا جائے۔(۵۸۰/۱)

(۳۸) بائبل کی آیتوں سے تقابل : بنواسرائیل کے بعض واقعات کی تفسیر میں بائبل کی آیتوں سے تقابل کیا گیا ہے؛ تاکہ قلبِ سلیم اور طبعِ نفیس رکھنے والے شخص پر قرآن کا حق ہونا واضح ہوجائے، مثلاً حضرت یعقوب علیہ السلام کے واقعہ کے ذیل میں مولانا لکھتے ہیں :

تورات کے بیان کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ایک بکری کے بچہ کو ذبح کردیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص کو اس کے خون میں ڈبوکر حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے پیش کیا، حضرت یعقوت علیہ السلام نے اپنے صاحبزادوں کی بات پر یقین کرلیا اور کہا کہ یوسف بے شک پھاڑا گیا، (دیکھئے: پیدائش: ۳۷: ۳۱) لیکن قرآن مجید کا بیان ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے

> اپنی فراست سے ان کی اس حرکت کو سمجھ لیا؛ کیوں کہ کپڑا تو خون میں تر بہ تر تھا؛ لیکن تھا بالکل صحیح سالم، اگر درندہ کسی شخص کو کھا جائے تو انسان سے پہلے وہ کپڑے کو پھاڑ ڈالے گا، ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنے شکار کا کپڑا اُتارے، پھر اسے کھائے۔(۱/ ۶۹۲)

(۳۹) دیگر دبستانِ فقہ سے استفادہ : اس تفسیر میں احکام ومسائل فقہ حنفی کے مطابق لکھے گئے ہیں؛ لیکن بعض مسائل میں مولانا نے اپنی فقیہانہ بصیرت کی بنیاد پر احوال زمانہ کو دیکھتے ہوئے فقہ حنفی سے عدول کر کے کوئی اور رائے اختیار کی ہے، مثلاً مؤلفۃ القلوب کے مسئلہ میں مولانا نے حنابلہ کی طرف عدول کیا ہے؛ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں :

> چوتھا مد ’مؤلفۃ القلوب‘ کا ہے، یعنی اول : ان غیر مسلموں کی امداد واعانت جن کے اسلام قبول کرنے کی اُمید ہو، دوسرے : ان غیر مسلم قائدین کی مدد کہ جن کے شر سے مسلمانوں کو بچانا مقصود ہو، تیسرے : وہ نومسلم جن کا ایمان ابھی کمزور ہو اور اُمید ہو کہ ان کی مدد انھیں دین پر ثابت قدم رکھے گی، (فتح القدیر : ۲/ ۲۰۰) یہ مد باقی ہے یا ختم ہوگئی؟ اس سلسلہ میں حنفیہ اور مالکیہ کی رائے ہے کہ اب یہ مد باقی نہیں رہی، حنابلہ کا نقطۂ نظر ہے کہ یہ مد باقی ہے اور بوقت ضرورت اس سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے، اور امام شافعیؒ سے دونوں طرح کی رائیں منقول ہیں، (حوالہ کے لئے دیکھئے : شرح المہذب : ۴/ ۱۹۷، الجامع لأحکام القرآن : ۸/ ۱۸۱، المغنی : ۲/ ۲۸۰) موجودہ حالات میں حنابلہ کا قول شریعت کے مقاصد ومصالح سے زیادہ ہم آہنگ نظر آتا ہے اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا رجحان بھی اسی طرف ہے، (حجۃ اللہ البالغۃ مع الترجمہ : ۲/ ۱۰۵)۔(۱/ ۵۸۷)

(۴۰) رموزِ تحریر وقواعد املا : ترجمہ کی طرح تفسیری حاشیہ میں بھی رموزِ تحریر اور قواعدِ املا کی پوری رعایت برتی گئی ہے، جس سے نہ صرف یہ کہ تحریر میں خوبصورتی پیدا ہوگئی ہے؛ بلکہ عبارت کو پڑھنا اور مفہوم کو سمجھنا بہت آسان ہوگیا ہے۔

وقت کم ہے گفتگو پھیلاؤں کیا؟ اپنی بات سمیٹتے ہوئے کہتا ہوں کہ یہ جو آسان ترجمہ وتفسیر ہے، ایک نسخۂ اکسیر ہے، اس کی عبارت سلیس اور اُسلوبِ نگارش نفیس ہے، اس میں ادب کی حلاوت اور زبان کی سلاست ہے، دارالافتاء ہو یا مجمع فقہ اسلامی، حلقۂ درسِ حدیث ہو یا محفلِ فہم قرآنی، میدانِ تبلیغ ودعوت ہو یا ادارۂ تعلیم وتربیت،

محکمۂ قضا ہو یا انجمنِ اصلاحِ معاشرہ، بزمِ زبان وادب ہو یا محاذِ دفاعِ شریعت، ہر جگہ حضرت الاستاذ مولانا رحمانی کی علمی وعملی شمع فروزاں نظر آتی ہے، ڈاکٹر کلیم عاجز مرحوم کے الفاظ میں :

کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اِک چراغ جلا دیا

مولانا نے تفسیر کا جو یہ چراغ جلایا ہے، اُمید ہے کہ یہ بھی کاروانِ فکر ونظر کے لئے قندیلِ رہبانی ثابت ہوگا، دل کے طاقچوں کی زینت بنے گا اور نگاہ کے لئے سرمۂ بصیرت ثابت ہوگا، رب کریم سے اسی کی اُمید ہے اور یہی دُعا ہے، رب کریم قبول فرمالے۔ آمین

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين .

● ● ●

گندے پانی کو پاک کرنے کا جدید طریقہ فقہ اسلامی کی روشنی میں

مولانا سید احمد ومیض ندوی☆

پانی زندگی کے لئے ایک ایسا لازمہ ہے، جس کے بغیر کرۂ ارض پر کسی جاندار مخلوق کا تصور ممکن نہیں، ارشاد خداوندی ہے :

وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ ۔ (۱)

اور ہر زندہ چیز کو ہم نے پانی سے بنایا، کیا وہ لوگ ایمان نہیں لاتے؟

دوسری جگہ ارشاد ہے :

وَ اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۔ (۲)

تمام کے تمام چلنے پھرنے والے جانداروں کو اللہ تعالیٰ ہی نے پانی سے پیدا کیا۔

ماہرین کے مطابق ہر زندہ وجود کے خلیوں کی ترکیب میں پانی اہم عنصر ہوتا ہے، چاہے وہ نباتات کے قبیل سے ہو، یا حیوانات کے، نیز علم الاعضاء کے ماہرین کا کہنا ہے کہ کوئی عضو پانی کے بغیر اپنی کارکردگی برقرار نہیں رکھ سکتا، مظاہر حیات اور اس کے بنیادی عناصر کا قیام پانی کے بغیر ممکن نہیں، (۳) پانی کی اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن مجید میں پانی کا ذکر ۶۳ مرتبہ کیا گیا ہے، (۴) پینے کے لئے پانی تمام حیوانات کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، ارشاد ربانی ہے :

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ، لِّنُحْیِیَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا وَّنُسْقِیَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّ اَنَاسِیَّ كَثِیْرًا ۔ (۵)

☆ استاذ : جامعہ اسلامیہ دار العلوم حیدر آباد۔

(۱) الانبیاء:۳۰۔ (۲) النور:۴۵۔

(۳) الماء والانسان والکون:۸۵، مطبوعہ: عالم الکتب، قاہرہ۔

(۴) حوالہ سابق۔ (۵) الفرقان:۴۸-۴۹۔

اور ہم آسمان سے پاک پانی برساتے ہیں؛ تاکہ اس کے ذریعہ مردہ شہر کو زندہ کریں
اور اسے ہم اپنی مخلوقات میں بہت سے چوپایوں اور انسانوں کو پلاتے ہیں۔

نباتات کا سارا نظام اسی پر قائم ہے، نظافت، صفائی ستھرائی اور طہارت کے تمام تقاضے پانی ہی سے پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں، انسانی جسم کے سرگرم اور فعال اعضاء دماغ، دل، جگر وغیرہ میں غیر سرگرم اعضاء جیسے ہڈی، دانت کے مقابلہ میں پانی کا تناسب زیادہ ہوتا ہے۔(۱)

جدید صنعتی ترقی نے تو پانی کی اہمیت کو دوچند کردیا ہے، بجلی کی فراہمی میں پانی کا اہم کردار ہوتا ہے، جس پر ساری صنعتی ترقیات کا انحصار ہے، کسی بھی قوم یا ملک کی مجموعی ترقی میں آبی وسائل اور آبی ذخائر غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں، آبی وسائل سے محرومی یا پانی کا بحران ملکی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ ہوتا ہے، جدید تمدن اور اس کی حیرت انگیز صنعتی ترقیات نے پانی کی ضرورت واہمیت اور اس کے استعمال میں بے پناہ اضافہ کردیا ہے، جس کے نتیجہ میں پانی کی پاکی وناپاکی سے متعلق بے شمار نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔

پانی کی غیر معمولی بڑھتی ہوئی طلب کے پیش نظر اب استعمال شدہ اور گندے نالوں کے پانی کو جدید ٹیکنک کے ذریعہ صاف کرکے قابل استعمال بنایا جارہا ہے، یورپ اور مغربی ملکوں میں اس قسم کی ٹیکنک کا استعمال عام ہے، اس کے لئے وسیع وعریض پلانٹ قائم ہیں، بعض ترقی یافتہ مشرقی ممالک میں بھی اس تعلق سے کافی پیش رفت ہوئی ہے، جو ممالک قلت آب یا آبی بحران سے دوچار ہیں، ان میں اس قسم کی ٹیکنک غیر معمولی اہمیت اختیار کرلیتی ہے، ڈرینج کے گندے نالوں میں بہنے والا پانی کئی اعتبارات سے مخدوش ہوتا ہے، اس میں جہاں بول وبراز اور ہر قسم کی گھریلو گندگیاں ڈالی جاتی ہیں، وہیں بہت سے جانوروں کے مرکر بہہ جانے کا اندیشہ ہے، یہ پانی انتہائی آلودہ ہوتا ہے، اس سے ہٹ کر زرعی اور صنعتی مقاصد کے لئے استعمال کیا جانے والا پانی بھی آلودہ ہوتا ہے، مختلف کمپنیوں اور فیکٹریوں کے فضلات کے ساتھ خارج ہونے والا پانی بے انتہا آلودہ ہوتا ہے، اس قسم کے گندے پانی کو جدید ٹیکنک کے ذریعہ پاک کرکے استعمال میں لانے کا رجحان مغربی ملکوں میں کس قدر بڑھ رہا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آسٹریلیا کے ۹۷ فیصد باشندے زرعی مقاصد کے لئے ایسے پانی کے استعمال کے حق میں ہیں، جب کہ ۶۶ فیصد کی رائے ہے کہ ایسے پانی کو بیت الخلاء اور نہانے کے لئے استعمال کیا جانا چاہئے، ۲۰ تا ۳۰ فیصد افراد کی رائے میں ایسا پانی پینے کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، ایمسٹرڈم میں کرائے گئے ایک سروے کے مطابق وہاں کے ۹۷ فیصد افراد نے اس قسم کے پانی کے بیت الخلاء کے لئے استعمال کو درست قرار دیا جب کہ

(۱) الماء والانسان والکون: ۱۰۸، مطبوعہ: عالم الکتب، قاہرہ۔

۸۰ فیصد افراد نے کپڑوں کی صفائی کے لئے استعمال کی رائے دی، امریکہ میں ۵۰ فیصد افراد شخصی اغراض کے لئے اس قسم کا پانی استعمال کرتے ہیں، اس پس منظر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جدید طریقوں کے ذریعہ پاک کئے جانے والے گندے پانی کا شرعی حکم کیا ہے؟ ایسا پانی شرعاً پاک سمجھا جائے گا یا نہیں اور اس سے پاکی حاصل کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ناپاک پانی کو پاک کرنے کے تعلق سے ائمہ اربعہ کے مسالک پر مختصر روشنی ڈالی جائے؛ تاکہ ان کی روشنی میں گندے پانی کو پاک کرنے کے جدید طریقوں کا جائزہ لیا جاسکے۔

پانی کی پاکی وناپاکی کا معیار

فقہاء کے یہاں ناپاک پانی کی تطہیر کی مختلف شکلوں پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ پانی کب ناپاک ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں مسالک فقہاء کی تنقیح یوں ہے: امام مالکؒ کے مسلک مختار میں جب تک پانی کے تین اوصاف (رنگ، بُو، مزہ) میں سے کوئی ایک متغیر نہ ہو وہ وقوع نجاست سے ناپاک نہیں ہوتا، خواہ پانی قلیل ہو یا کثیر، امام شافعی اور امام احمد بن حنبلؒ کے یہاں اگر پانی قلیل ہو تو وقوع نجاست سے ناپاک ہوجاتا ہے، اگرچہ اوصاف ثلاثہ میں سے کوئی وصف نہ بدلے اور اگر کثیر ہو تو ناپاک نہ ہوگا، جب تک اوصاف ثلاثہ میں سے اکثر متغیر نہ ہوں اور ماء کثیر کی مقدار قلتین ہے، علماء احناف کے یہاں بھی پانی کی نجاست وعدم نجاست میں قلت وکثرت ہی معیار ہے؛ لیکن ان کے یہاں قلیل وکثیر کی کوئی مقدار متعین نہیں، اسے مبتلی بہ کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے؛ البتہ امام ابو یوسفؒ سے اتنی تحدید منقول ہے کہ نجاست کا اثر اگر ایک کنارے سے دوسرے کنارے کو سرایت کر جائے تو وہ ماء قلیل ورنہ ماء کثیر، جسے فقہائے متاخرین نے دَہ در دَہ سے تعبیر کیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ مالکیہ کے یہاں پانی کی نجاست وعدم نجاست کا دار مدار اوصاف ثلاثہ کے تغیر وعدم تغیر پر ہے، جب کہ دیگر فقہاء کے یہاں قلت وکثرت اصل معیار ہے۔

ناپاک پانی کی تطہیر کے طریقے

کتب فقہ میں ناپاک پانی کو پاک کرنے کی مختلف شکلیں ذکر کی گئی ہیں، من جملہ ان کے ایک مکاثرہ ہے، جسے جمہور ائمہ شافعیہ، حنابلہ اور مالکیہ نے اختیار کیا ہے، مکاثرہ یہ ہے کہ ماء قلیل جو وقوع نجاست سے ناپاک ہوجائے اس میں مزید پانی شامل کر کے اسے ماء کثیر بنا دیا جائے، پھر ان حضرات کے یہاں اس سلسلہ کی بڑی تفصیلات ہیں، جن کا ذکر طوالت سے خالی نہیں۔

ناپاک پانی کی تطہیر کا دوسرا طریقہ نزح ہے، یعنی کنوئیں سے ایک متعین مقدار میں پانی نکالا جائے، اس کے لئے پہلے اس چیز کا نکالا جانا ضروری ہے، جس کے سبب پانی ناپاک ہوا ہے، جیسے مردار جانور وغیرہ، پھر احناف کے یہاں گرنے والے جانور کے اعتبار سے نکالے جانے والے پانی کی الگ الگ مقدار متعین ہے، اسی طرح نجاست اگر ماء جاری میں گر جائے تو پانی کا جاری ہونا نجاست کو بے اثر کر دیتا ہے، ماء جاری اگر کثیر ہو اور اوصاف میں تغیر نہ آیا ہو تو اس کے پاک ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں؛ البتہ قلیل ماء جاری میں اگر نجاست گر جائے اور اوصاف ثلاثہ متغیر نہ ہوں تو حنفیہ(۱) حنابلہ(۲) اور امام مالکؒ (۳) کے نزدیک ناپاک نہ ہوگا، امام شافعی کا قول قدیم بھی یہی ہے، (۴) لیکن امام شافعی کے قول جدید میں ایسا پانی ناپاک ہوجاتا ہے، جس طرح ٹھہرا ہوا پانی ناپاک ہوجاتا ہے، (۵) شافعیہ(۶) اور حنابلہ(۷) کے یہاں ناپاک پانی کی تطہیر کا ایک طریقہ مکث وتقادم بھی ہے، یعنی ناپاک پانی پر عرصہ دراز کا گذر جانا بھی زوال نجاست کا سبب بنتا ہے، ان کے یہاں مرور زمانہ بھی پانی کے اوصاف ثلاثہ پر اثر انداز ہوتا ہے، حنفیہ نے اس کے لئے پانی کے جاری ہونے کو ضروری قرار دیا ہے، نیز مٹی گچ وغیرہ ڈالنے سے اگر ناپاک پانی کی نجاست کا اثر زائل ہوجاتا ہے تو اسے بھی علماء نے تطہیر کی شکل قرار دیا ہے، جس طرح عصر حاضر میں گندے نالوں یا استعمال شدہ فاضل پانی کو پاک کرنے کی شکل ہے، جس کے لئے بعض کیمیائی مادے استعمال کئے جاتے ہیں، جس سے نجاست کے سارے اثرات زائل ہوجاتے ہیں؛ لیکن بعض فقہاء نے اس سے اختلاف کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اس سے اثرات بالکلیہ زائل نہیں ہوتے؛ بلکہ شامل کئے جانے والے کیمیائی اجزا کے سبب وہ چھپ جاتے ہیں۔

تبدیل ماہیت کا طریقہ

سطور بالا میں ناپاک پانی کو پاک کرنے کے جن طریقوں کی نشاندہی کی گئی ہے بالعموم مذاہب اربعہ کی کتب میں ان کا ذکر ملتا؛ لیکن زیر بحث مسئلہ میں نتیجہ تک پہنچنے کے لئے سب سے زیادہ جس سے مدد ملتی ہے وہ تبدیل ماہیت کی شکل ہے جس پر فقہاء نے بحث کی ہے اور اشیاء کی نجاست وطہارت اور حلت وحرمت کے باب میں اس کی بڑی اہمیت ہے، سب سے پہلے فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں تبدیل ماہیت کی حقیقت جاننا ضروری ہے؛ چنانچہ فقہاء نے استحالہ یا تبدیل ماہیت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :

انقلاب حقيقة إلىٰ حقيقة أخرىٰ لا مجرد انقلاب وصف۔ (۸)

(۱) البحر الرائق: ۱/ ۸۸-۸۹۔ (۲) المغنی: ۱/ ۳۵۔ (۳) الکافی: ۱/ ۶۴-۶۵۔
(۴) المجموع: ۱/ ۲۰۱۔ (۵) الجمل شرح المنہج: ۱/ ۴۴۔ (۶) مغنی المحتاج: ۱/ ۲۔
(۷) المغنی: ۱/ ۳۷۔ (۸) حاشیہ ابن عابدین، کتاب الطہارۃ باب الانجاس: ۱/ ۳۴۔

تبدیل ماہیت نام ہے ایک حقیقت کے دوسری حقیقت میں تبدیل ہوجانے کا، محض وصف کا بدلنا تبدیل ماہیت نہیں۔

صاحب القاموس الفقہی سعدی ابوحبیب نے استحالۃ عین کی تعریف یوں کی ہے: ''**تغير الشئ عن طبيعته ووصفه**''(۱) صاحب معجم الفقہاء کے مطابق کسی چیز کی ماہیت کا اس طرح بدل جانا کہ اپنی سابقہ حالت پر واپس آنا ممکن نہ ہو، تبدیل ماہیت کہلاتا ہے، (۲) تبدیل ماہیت کی مذکورہ تعریفات سے واضح ہوتا ہے کہ تبدیلی تبھی معتبر ہوگی جب کسی چیز کی حقیقت بالکلیہ بدل جائے، محض بعض آثار کا زائل ہونا یا بعض صفات غیر مؤثرہ کا نہ پایا جانا تبدیل ماہیت نہیں، اس تعلق سے مفتی نظام الدین اعظمیؒ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں :

> قلب ماہیت تو یہ ہے کہ سابق حقیقت معدوم ہوکر نئی حقیقت ونئی ماہیت بن جائے، نہ پہلی حقیقت وماہیت باقی رہے، نہ اس کا نام باقی رہے، نہ اس کی ضرورت وکیفیت باقی رہے، نہ اس کے خواص وآثار وامتیازات باقی رہیں؛ بلکہ سب چیزیں نئی ہوجائیں۔(۳)

اس نوعیت کی تبدیل ماہیت کے تعلق سے فقہاء احناف کا مسلک مختار یہ ہے کہ انقلاب ماہیت اور تبدیل عین حکم کی تبدیلی کا سبب ہوتا ہے؛ چنانچہ مشہور فقیہ علامہ طحطاوی لکھتے ہیں :

> **الاستحالة تطهر الاعيان النجسة وهو قول محمد و رواية عن الإمام وعليه أكثر المشائخ وهو المختار في الفتوىٰ۔** (۴)
>
> استحالہ عین کی وجہ سے عینی نجاستیں پاک ہوجاتی ہیں، یہ امام محمدؒ کا قول ہے اور امام اعظمؒ سے ایک روایت ہے اور کثر مشائخ کا یہ مسلک ہے اور فتویٰ کے لئے یہی قول مختار ہے۔

کتبِ فقہ میں اس کی متعدد مثالیں مذکور ہیں، گدھا نمک کے کان میں گر کر نمک ہوجائے تو اس نمک کا استعمال درست ہے، اسی طرح شراب سرکہ بن جائے وغیرہ۔

گندے پانی کو پاک کرنے کا جدید طریقہ

تبدیل ماہیت کے مذکورہ قاعدہ کی روشنی میں اب یہ دیکھنا ہے کہ گندے نالوں کے پانی یا استعمال شدہ

---

(۱) القاموس الفقہی: ۱۰۵، مطبوعہ کراچی۔
(۲) معجم لغۃ الفقہاء، مطبوعہ بیروت۔
(۳) منتخبات نظام الفتاویٰ: ۱/ ۶۶۔
(۴) حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح: ۸۶، طبع دمشق۔

فاضل پانی کو جدید طریقوں سے جو پاک کیا جاتا ہے، کیا اس طریقہ کار سے ایسی تبدیلی ماہیت ہوجاتی ہے کہ پانی کے سارے ناپاک اجزا ختم ہوجائیں اور نجاست کا کوئی اثر باقی نہ رہے؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلے گندے نالوں کے پانی کی تطہیر کے جدید طریقوں کی نوعیت کا جاننا ضروری ہے، رابطہ عالم اسلامی کے تحت قائم اسلامی فقہ اکیڈمی کے گیارہویں اجلاس میں جو فروری ۱۹۸۹ء میں منعقد کیا گیا تھا، اس مسئلہ پر غور وخوض کیا گیا تھا، اس وقت کیمیاوی طریقہ پر پانی کی صفائی کے ماہرین سے رُجوع کیا گیا تو ماہرین نے واضح کیا کہ اس صفائی میں پانی سے نجاست کو چار مرحلوں میں دُور کیا جاتا ہے، پہلا مرحلہ ترسیب کا ہے، یعنی پانی کو اس طرح جمع کرنا کہ اس کی کدورتیں نیچے بیٹھ جائیں، دوسرا مرحلہ اوپر کے پانی کو چھان کر الگ کرلینا ہے، تیسرا مرحلہ بیکٹر یاز کو ماردینا اور چوتھا مرحلہ کلورین کے ذریعہ بیکٹر یاز کو دوبارہ پیدا ہونے سے روک دینا ہے، ماہرین کے مطابق ان مرحلوں کے بعد پانی کے مزہ، رنگ اور بو میں نجاست کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا، یہ ماہرین مسلمان، عادل اور صدق امانت میں قابل اعتماد ہیں۔(۱)

رابطہ عالم اسلامی کی فقہ اکیڈمی کا فیصلہ

ماہرین کی جانب سے بتائی گئی تفصیلات کی بنیاد پر رابطہ کی فقہ اکیڈمی کے گیارہویں اجلاس منعقدہ مکہ مکرمہ میں عصری طریقوں سے پاک کئے گئے گندے نالوں کی پانی سے متعلق فیصلہ میں کہا گیا کہ جاری پانی کو اگر مذکورہ بالا یا اس جیسے عمل کے ذریعہ صاف کردیا جائے اور اس کے مزہ، رنگ اور بو میں نجاست کا کوئی اثر باقی نہ رہے تو پانی پاک ہوجائے گا اور اس پانی سے پاکی کا حصول اور نجاست کا ازالہ اس فقہی قاعدہ کی بنیاد پر ہوجائے گا کہ اگر زیادہ پانی میں گری ہوئی نجاست کا ازالہ اس طرح ہوجائے کہ اس کا کوئی اثر باقی نہ رہے تو پانی پاک ہوجاتا ہے، اسی طرح عالم اسلام کے دیگر فقہی اداروں اور فتویٰ کمیٹیوں کی جانب سے بھی اس قسم کے پانی کے پاک ہونے کا فتویٰ دیا گیا ہے، ذیل میں انھیں بھی درج کیا جاتا ہے۔

وزارت اوقاف واُمور اسلامی کویت کے ادارۃ الفتویٰ کا فتویٰ

ادارۃ الفتویٰ کی جانب سے ۱۴ر شعبان ۱۴۱۶ھ میں دیئے گئے فتویٰ میں کہا گیا ہے کہ گندے نالوں کے پانی کی تطہیر شرعاً ممکن ہے، اس طور پر کہ اس سے ساری جسم دار نجاستوں کو نکال لیا جائے، پھر پانی میں نجاست کے جو اوصاف، سرایت کر گئے ہیں انھیں مکمل طور پر زائل کردیا جائے، یہ عمل کسی بھی فراہم وسیلہ کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے،

(۱) مجلۃ البحوث الفقہیہ المعاصرہ، السنۃ الاولیٰ، العدد الثانی: ۱۸۶۔

اگرعمل تطہیر کے بعد پانی میں نجاست کا کوئی اثر باقی نہ رہے تو ایسے پانی کی پاکی کا حکم لگایا جائے گا، خواہ اس قسم کا پانی پینے کے لائق ہو یا نہ ہو، طبی نقطۂ نظر سے اگر یہ پانی پینے کے لائق ہو تو پینے کی بھی اجازت دی جائے گی ورنہ نہیں؛ لیکن ادارہ کا مشورہ ہے کہ اس قسم کا پانی زرعی وصنعتی مقاصد اور حیوانات کی سیرابی کے لئے استعمال کیا جائے اور پینے کے لئے استعمال سے گریز کیا جائے، خواہ ایسا پانی کتنا ہی پاک وصاف کیوں نہ ہو۔(۱)

علامہ یوسف القرضاوی کا فتویٰ

گندے نالوں کے جدید طریقہ سے پاک کئے گئے پانی کے تعلق سے پوچھے گئے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے عالم اسلام کے ممتاز فقیہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی لکھتے ہیں :

جاننا چاہئے کہ جس پاک پانی کا استعمال ہر طرح درست ہے وہ ایسا ماءِ مطلق ہے، جو اپنی اصل خلقت پر برقرار ہو اور اس کے اوصاف ثلاثہ متغیر نہ ہوئے ہوں، اگر اوصاف ثلاثہ متغیر ہوں تو دیکھا جائے گا کہ پانی میں ملی ہوئی چیز پاک ہے یا ناپاک، پانی کی طہارت ونجاست سے متعلق فقہاء نے اپنی کتابوں میں تفصیلی گفتگو فرمائی ہے؛ لیکن زیر دریافت مسئلہ میں یہ بات طے ہے کہ نالوں کا پانی ناپاک ہے؛ لیکن ایسے پانی کو جب تطہیر کے جدید طریقے استعمال کرکے پاک کرلیا جائے، جو کہ چار مراحل میں پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں، تو چوں کہ یہ طریقے بالکلیہ نجاست کے ازالہ کے ضامن ہوتے ہیں، رنگ، مزہ، بو ہر اعتبار سے نجاست زائل ہوجاتی ہے، اس لئے ایسے پانی پر پاکی کا حکم لگا دیا جائے، اس لئے کہ تطہیر کے مذکورہ طریقوں کے استعمال کے بعد پانی اپنی اصل یعنی صفت طوریت کی طرف لوٹ آتا ہے، پانی کی ناپاکی کا حکم علت نجاست کے ساتھ وابستہ ہے، جب علت نجاست ختم ہوگئی تو حکم اصل کی طرف لوٹے گا، فقہی ضابطہ کی روشنی میں اگر جدید طریقوں سے نالوں کے پانی کو اس طور پر پاک کیا جائے کہ نجاست کا اثر بالکل زائل ہوجائے تو ایسے پانی کا استعمال وضو غسل وغیرہ میں جائز ہوگا۔(۲)

---

(۱) مجلۃ الشریعۃ والدراسات الاسلامیہ: ۴۶۳-۴۶۴، شمارہ نمبر: ۰۷، اشاعت: ۱۴۲۸ھ، ۲۰۰۷ء۔

(۲) فتاویٰ معاصرہ، سائٹ۔

ہیئۃ کبار العلماء سعودی عرب کا فیصلہ

فقہاء کے یہاں ناپاک کثیر پانی نجاست کے اثرات کے ازالہ سے پاک ہوجاتا ہے اور موجودہ گندے نالوں کے ناپاک پانی کو مختلف جدید ذرائع سے پاک کیا جانا ممکن ہے، جن میں ترشیح وتطہیر کے جدید فنی طریقے استعمال کئے جاتے ہیں اور ماہرین کے مطابق ان طریقوں سے نجاست کے اثرات بالکلیہ زائل ہوجاتے ہیں، اس لئے ہیئۃ کبار العلماء ایسے پانی کو پاک قرار دیتی ہے، بشرطیکہ پانی اپنی پہلی خلقت کی جانب لوٹ چکا ہو اور اس کے رنگ مزہ و بو میں نجاست کا کوئی اثر باقی نہ ہو، اس قسم کا پانی نجاستوں کے ازالہ اور حصول طہارت کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، اگر طبی نقطۂ نظر سے صحت کے لئے نقصان دہ نہ ہو تو اسے پینے کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر حسام الدین عفانہ کا فتویٰ

نالوں کے گندے پانی کو اگر جدید فنی طریقوں سے اس طرح پاک کیا جائے کہ نجاست کے اثرات بالکلیہ زائل ہوجائیں تو پانی اپنی اصلیت یعنی طہارت کی طرف لوٹ آئے گا، ایسے پانی کے پاک ہونے کا حکم لگادیا جائے گا؛ چوں کہ علت نجاست کے سبب ناپاکی کا حکم تھا، جب علت ختم ہوگئی تو پاکی لوٹ آئے گی۔(۱)

بعض معاصر اہل علم کی عدم جواز کی رائے

اگر چہ ہند وعرب کے بیشتر علماء جدید طریقوں کو استعمال کرکے پاک کئے جانے والے گندے پانی کی پاکی ہی کے قائل ہیں، جیسا کہ سطور بالا سے واضح ہوا؛ لیکن بعض معاصر اہل علم نے اس سے اختلاف کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ موجودہ گندے نالوں کے پانی میں جس طرح ہمہ اقسام کی نجاستیں شامل ہوجاتی ہیں؛ تطہیر کے جدید طریوں سے ان کی تبدیل ماہیت نہیں ہوتی، ان کا کہنا ہے، استحالہ الگ چیز ہے اور تجزیہ ایک الگ شئے ہے، کسی چیز کی حقیقت وماہیت کا کلی طور پر بدل جانا استحالہ یا تبدیل ماہیت کہلاتا ہے اور اس سے احکام بدلتے ہیں، اس کے برخلاف کسی شئے کے مختلف اجزاء کو الگ کردینا تجزیہ کہلاتا ہے، جس سے احکام نہیں بدلتے، ان حضرات نے جدید طریقہ سے فلٹر کرکے پاک کئے جانے والے نجس پانی کو تبدیل ماہیت کے بجائے تجزیہ کا عمل قرار دیا ہے، جس طرح پیشاب کو فلٹر کرنے سے اس کی حقیقت نہیں بدلتی؛ بلکہ اس سے اس کے بدبودار اجزاء نکل جاتے ہیں، اس لئے ایسے پیشاب کو ناپاک ہی کہا جائے گا اور اسے وضو یا غسل وغیرہ میں استعمال نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح نجس پانی سے نجاست کے عناصر کو الگ کرنا صرف اس کے اجزا کو الگ کرنا ہے، ۲۰۰۱ء میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے تبدیل ماہیت کے

---

(۱) شبکۃ یسلونک الاسلامیہ۔

موضوع پر فقہی سیمینار کیا تھا، جس میں پیش کئے گئے مقالات میں جدید طریقوں سے پاک کئے گئے گندے پانی کی طہارت کا مسئلہ بھی زیر بحث لایا گیا ہے، اس میں بعض مقالہ نگار نے ایسے پانی کی طہارت کے تعلق سے عدم جواز کی رائے اختیار کی ہے، مثلاً مفتی جمیل احمد نذیری لکھتے ہیں :

> فلٹر یا کشید کرنے کے عمل کو انقلاب ماہیت نہیں کہہ سکتے ؛ کیوں کہ اس کے نتیجہ میں شئے کی خصوصیات اثر انگیزی وغیرہ بدلتی ہیں ، شئے کی حقیقت و ماہیت نہیں بدلتی ، یہ صرف ایک تحلیل و تجزیاتی عمل ہے، کسی شئے کے اجزا میں سے بعض کو علاحدہ کر لینا ہے، ناپاک پانی کے ہر جز میں ناپاکی اور نجاست حلول کئے ہوتی ہے، کسی تجزیاتی عمل سے اگر بظاہر ناپاک اجزا نکال دیئے جائیں تو بھی ان کا جو اثر پانی میں سرایت کر چکا ہے وہ پانی کو ناپاک بنا چکا ہے، اس کے پاک ہونے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ وہ ماء کثیر میں ملا دیا جائے ؛ البتہ جہاں نجاست اور شئے نجس دونوں کا امتیاز ممکن ہو وہاں نجاست کو الگ کر دینا اس شئے کو پاک بنادے گا ، جیسے چمڑے سے جب نجس رطوبت ختم کر دی جائے تو چمڑا پاک ہو جائے گا، خواہ مردار کا چمڑا ہو یا مذبوح جانور کا۔(۱)

ان کے علاوہ کچھ دیگر علماء نے بھی اس رائے کو ترجیح دی ہے۔

رکن اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ بکر ابوزید کی رائے

عرب علماء میں فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے رکن بکر ابوزید نے بھی عدم جواز کی رائے اختیار کی ہے، اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں :

> ● نالے دراصل اس غرض سے تیار کئے جاتے ہیں کہ لوگوں کے لئے دینی اور جسمانی اعتبار سے ضرر رساں چیزیں وہاں ڈال دی جائیں ؛ تاکہ پاکی حاصل رہے اور ماحول آلودگی سے محفوظ رہے۔
>
> ● اب ایسے جدید وسائل پیدا ہو گئے ہیں ، جن کے ذریعہ نالوں کے گندے پانی کو صاف اور شیریں پانی میں تبدیل کر کے اسے مختلف شرعی اور مباح استعمال کے قابل بنادیا جاتا ہے، جیسے اس پانی سے طہارت حاصل کرنا، اس کو پینا، اس سے سینچائی کرنا۔

---

(۱) جدید فقہی تحقیقات: ۱۰/۱۷۶۔

● اس ترقی کے پیش نظر جب نالے کے پانی کی ان علتوں اور اوصاف کی تحقیق کی جائے، جن کی وجہ سے اس پانی کے استعمال کی ہرصورت یا بعض صورتیں ممنوع تھیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ نالے کے پانی میں درج ذیل علتیں ہوتی ہیں :

● اول : مزہ، رنگ اور بو والے نجس فضلات۔

● دوم : متعدی امراض کے فضلات نیز دواؤں اور جراثیم کی کثافت۔

● سوم : گندگی اور خباثت جو نالے کے پانی میں اپنی اصل کے اعتبار سے ہوتی ہے اور یہ اس میں پیدا ہوجانے والے کیڑوں اور حشرات کی وجہ سے ہوتی ہے جو طبعاً اور شرعاً گندے ہوتے ہیں۔

● ایسے پانی کی صفائی کے بعد دیکھنا ضروری ہے کہ ان علل اور اسباب کا ازالہ کس حد تک ہوجاتا ہے؟

● اس لئے کہ اس پانی کا نجاست سے اس طرح تبدیل ہوجانا کہ اس کا رنگ، مزہ اور بو بدل جائے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں تمام علتیں اور نقصان دہ جراثیم بھی ختم ہوجاتے ہیں۔

● زارعتی محکمے برابر یہ آگاہی دیتے رہتے ہیں کہ صاف کئے گئے اس پانی سے ان کھیتوں کو سیراب نہ کیا جائے جن کی سبزیاں بغیر پکائے کھائی جاتی ہیں، تو ایسے پانی کو براہ راست پینا کیسا ہوسکتا ہے؟ جسم کی حفاظت اسلام کے مقاصد میں سے ہے، اور جس طرح دین کی درستگی کو نقصان پہنچانے والی چیزیں ممنوع ہیں اسی طرح جسم کی درستگی کو نقصان پہنچانے والی چیزیں بھی ممنوع ہوں گی۔

● اور اگر یہ علتیں زائل بھی ہوجائیں تو اپنی اصل کے اعتبار سے ایسے پانی میں خباثت اور گندگی کی علت باقی رہتی ہے؛ کیوں کہ یہ پانی پیشاب اور پاخانہ سے کشید کیا جاتا ہے؛ تاکہ اسے شرعیات اور عادات میں برابر طور پر استعمال کیا جائے۔

● یہ معلوم ہے کہ شافعی مسلک نیز حنابلہ کے معتمد مسلک کے مطابق استحالہ کی بنا پر یہ پانی پاک نہیں ہوگا، ان کا استدلال اس حدیث سے ہے، جس میں جلالہ (نجاست کھانے والے) جانور پر سواری کرنے اور اس کا دودھ دوہنے سے منع کیا

گیا ہے، اس حدیث کی روایت اصحابِ سنن وغیرہ نے کی ہے، نیز دیگر علتیں بھی ان فقہاء کے پیش نظر ہیں۔

● یہ بھی واضح ہے کہ نجاست سے طہارت میں تبدیل ہونے کے مسئلہ پر علماء متقدمین میں جو اختلاف ہے، اس کا تعلق چند خاص چیزوں سے ہے اور بالیقین انھوں نے بتدیلی کے حکم کو ان موجودہ نالوں پر منطبق نہیں کیا ہے، جن میں نجاستیں، گندگیاں، ڈسپنسری اور اسپتال کے گندے کوڑوں کا ڈھیر ہوتا ہے اور آج کے مسلمان ابھی اضطرار کی اس حالت کو نہیں پہنچے ہیں کہ پاخانہ کو صاف کر کے اس سے طہارت حاصل کریں اور ایسے پانی کو پییئں، کافر ملکوں میں اس کا درست قرار دیا جانا ہمارے لئے قابل اعتبار نہیں کہ ان کے طبائع کفر کی وجہ سے فاسد ہو چکے ہیں، ہمارے یہاں یہ متبادل موجود ہے کہ سمندر کے پانی کو صاف کیا جائے اور اخراجات کے ایک بڑے حصہ کو اس طرح پورا کیا جائے کہ پانی کے استعمال کی قیمت اتنی بڑھا دی جائے، جس میں ضرر نہ ہو؛ تاکہ پانی کے بے جا خرچ کی ممانعت کا شرعی قاعدہ جاری کیا جا سکے۔

جہاں تک صاحبِ مقالہ کی رائے کا تعلق ہے تو قائلین عدم جواز کا مسلک احتیاط پر مبنی ہے اور جمہور علماء ومحققین نے تیسیر کے پہلو کو اپنایا ہے، جدید تمدنی مسائل کے پیش نظر تیسیر اسی میں ہے کہ ایسے پانی کو علی الاطلاق پاک قرار دینے کے بجائے اسے شروط وقیود کے ساتھ پاک قرار دیا جائے، جن ملکوں میں ایسے پانی کے استعمال کے بغیر چارہ کار نہ ہو وہاں نجاست کے اثرات کے بالکلیہ ازالہ کی شرط کے ساتھ وضو طہارت وغیرہ کے لئے استعمال کی اجازت دی جائے اور جہاں ایسی ناگزیر صورت حال نہ ہو، وہاں احتیاط کا مشورہ دیا جائے۔

● ● ●

سی سی ٹی وی کیمرہ
مساجد،عبادت گاہوں میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟

مولانا جنید پالن پوری☆

سوال:- سی سی ٹی وی کیمرہ سے متعلق آپ سے شرعی حکم معلوم کرنا ہے، مدارس میں بھی نگرانی کی غرض سے اس کا استعمال ہوتا ہے اور چوں کہ بہت سی جگہوں پر تو قانونی حیثیت بھی حاصل ہے، اس سلسلہ میں ایک مضمون ماہنامہ ''صوت القرآن احمد آباد'' کے اگست ۲۰۱۰ء کے شمارے میں حضرت مفتی عبد القیوم صاحب جامعہ ڈابھیل کے حوالے سے شائع ہوا اور حضرت نے اس میں دلائل کے ساتھ مساجد میں سی سی ٹی وی کے استعمال کو ناجائز قرار دیا ہے اور چوں کہ آنجناب کے قلم سے عصری مسائل پر بڑی شاندار تحقیقات منظر عام پر آئی ہیں؛ لہٰذا اُمید ہے کہ اس مسئلے پر بھی تشفی بخش جواب مرحمت فرمائیں گے۔(مفتی عمار منصوری، گجراتی)

جواب:- اس مسئلہ میں علمائے ربانیین کا آپس میں اختلاف ہے، دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، جامعہ ڈابھیل، جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، جامعہ فاروقیہ، جامعہ خلفائے راشدین اور دیگر مدارس کے مفتیان کرام کے نزدیک مطلقاً تصویر حرام ہے، جس میں ڈیجیٹل تصویر بھی شامل ہے، جب کہ مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد رفیع عثمانی دامت برکاتہم، شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کے علاوہ دار العلوم کراچی، جامعہ بنوریہ العالمیہ، جامعۃ الرشید اور کئی مدارس کے جید مفتیان کرام اور ہندوستان سے حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ ڈیجیٹل کیمرہ سے لی گئی تصویر برقی شعاؤں کے ذریعہ اُبھرنے والا نقش ہے، یہ تصویر کے حکم میں نہیں ہے؛ لہٰذا یہ جائز ہے البتہ اس کا پرنٹ نکالا جائے تو اب یہ تصویر ہی کہلائے گا۔

☆ دار الافتاء والارشاد، مجلس البرکۃ، ممبئی۔

سی سی ٹی وی کیمرہ کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں کہ حفاظتی تدابیر میں شامل ہے، انسانی نگرانی سے زیادہ بہتر طور پر سی سی ٹی وی کیمرہ نگرانی کر لیتا ہے، محکمہ پولیس کے بیان کے مطابق جن علاقوں اور جگہوں میں کیمرہ نصب کئے گئے ہیں، ان علاقوں میں چوری، ڈکیتی نیز دیگر مجرمانہ وارداتوں میں واضح طور پر کمی آئی ہے اور اگر واردات ہو بھی جاتی ہے تو مجرموں تک پہنچنا آسان ہوجاتا ہے، عدالتیں بھی ان کیمرہ میں محفوظ فوٹیج کو ثبوت مانتی ہیں، بڑے شہروں میں محکمہ پولیس حساس جگہوں پر کیمرہ نصب کرنے کا مشورہ دیتی ہے اور کبھی حکم کرتی ہے، خاص طور پر مذہبی مقامات پر تجربہ ہے کہ چوروں اور مجرموں کے لئے مسجدوں کی چندہ پیٹی سے رقوم کا چوری کرنا، نیز مصلی حضرات کے جوتے، چپلوں پر ہاتھ صاف کرنا، جماعت کی نماز میں سجدہ میں گئے مصلیوں کے فرش پر رکھے ہوئے موبائل آسان اہداف میں سے تھا، مگر جب سے سی سی ٹی وی کیمرہ نام والی تیسری آنکھ لگائی گئی، مسجدوں کی چندہ پیٹی، مصلی حضرات کے موبائل نیز جوتے چپل محفوظ ہو گئے، ان سب چیزوں سے بڑھ کر یہ کہ آج کل جس طرح کے ناگفتہ بہ حالات ملک میں چل رہے ہیں کہ مسجدوں اور عبادت گاہوں میں گھس کر شرانگیزی کی جارہی ہے؛ بلکہ مار پیٹ کے واقعات سامنے آرہے ہیں، ان واقعات کے بعد عوام کی طرف سے موبائل کیمروں میں محفوظ فوٹیج کے ذریعہ ہی شر پسندوں تک رسائی آسان ہوئی ہے؛ لہٰذا دینی اور ان جیسی دنیاوی ضرورتوں کی خاطر ان حضرات کی رائے پر عمل کی گنجائش ہوگی، جو ڈیجیٹل کیمرہ کی تصویر کو جائز کہتے ہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ناگزیر حالات میں پرنٹ تصویر کے تمام قائل ہیں، جیسے پاسپورٹ ودیگر سرکاری کاغذات کے لئے تصویر اُٹھانا؛ لیکن شادی بیاہ ودیگر تقریبات کی فلمیں اور واٹس ایپ وای میل، شوقیہ فلمیں، پروفائل اور ڈی پی وغیرہ پر لگانے کے لئے جاندار کی تصویر لینے کی اجازت نہ ہوگی، اس وقت ان حضرات کے قول پر عمل کیا جائے جو ڈیجیٹل کیمروں کی تصویر کو بھی ناجائز کہتے ہیں، واللہ اعلم۔

• • •

اولاد اور والدین کے نفقات — احکام ومسائل

مولانا اشرف علی قاسمی ☆

شریعتِ اسلامیہ میں جہاں بیوی کے نفقات واخراجات اور ضروریاتِ اصلیہ کی تکمیل مردوں پر رکھی گئی ہے، وہیں اپنے والدین، اولاد اور دیگر اقرباء ورشتہ دار کے اخراجات کی ذمہ داری بھی مردوں پر ڈالی گئی ہے، ذیل کی سطریں ان ہی سے متعلق تحریر کی جارہی ہیں۔

رشتہ کے اقسام

رشتے تین طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ ہیں، جن سے پیدائش یعنی باپ بیٹے ہونے کا تعلق ہے، دوسرے وہ ہیں، جن سے اس نوعیت کا تعلق تو نہیں؛ البتہ ایسی قرابت ورشتہ داری ہے، جن سے نکاح کرنا حرام ہوتا ہے، جیسے کہ بہن، پھوپھی، خالہ، کہ ان سے نکاح کرنا شرعاً حرام ہے، تیسرے وہ رشتہ دار ہیں، جن سے نہ نکاح حرام ہے اور نہ ان سے اولاد کی پیدائش کا تعلق ہے، مثلاً چچازاد بھائی بہن، ماموں زاد بھائی بہن — یہ ایسی قرابتیں ہیں کہ ان کی وجہ سے نکاح حرام نہیں ہوتا۔

فقہاء احناف کا اتفاق ہے کہ ایسے رشتہ دار جن سے باپ بیٹے اور پیدائش کا تعلق ہو، ان کے نفقہ کی ذمہ داری ہر شخص پر عائد ہوتی ہے، اسی طرح جو افراد ذی رحم ہونے کے ساتھ ساتھ محرم بھی ہوں تو ان رشتہ داروں کے نفقہ کی ذمہ داری بھی عائد ہوسکتی ہے؛ البتہ جو افراد رشتہ دار ہوں؛ لیکن محرم نہ ہوں (مثلاً چچازاد بھائی، ماموں زاد بھائی وغیرہ) ان کے نفقہ کی کسی پر ذمہ داری نہیں ٹھہرائی جائے گی اور شرعاً نفقہ کی ادائیگی پر مجبور نہیں کیا جائے گا، اسی طرح ان کے نفقہ کی ذمہ داری بھی دوسرے پر عائد نہیں کی جاسکتی، جن سے نکاح تو حرام ہو؛ لیکن وہ ذی رحم نہ ہوں، جیسے کہ رضاعی بھائی بہن کہ یہ غیر ذی رحم اور محرم ہیں اور رضاعی بھائی بہن کے ذمہ ان کا نفقہ نہیں۔(۱)

حنابلہ کے یہاں ہر انسان پر صرف ایسے رشتہ داروں ہی کے نفقہ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو بطورِ فرض

☆ استاذ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

(۱) الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۱۰/ ۷۴۲۶۔

یا بطورِ تعصیب وارث بنتے ہوں، مثلاً حقیقی بھائی، والدین، اولاد اور چچا وغیرہ، اور جو رشتہ دار کسی طور وارث نہ بنتے ہوں تو ان کے نفقات دوسرے رشتہ دار پر واجب نہیں ہیں۔(۱)

شافعیہ اور مالکیہ کا مسلک یہ ہے کہ ہر انسان پر صرف اپنے والدین اور اولاد کے نفقہ کی ذمہ داری عائد ہوگی، دوسرے رشتہ داروں کا نفقہ واجب نہ ہوگا۔(۲)

سب سے پہلے ان رشتہ داروں کے نفقہ کی تفصیل بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، جن سے ولادت و پیدائش کا تعلق ہو۔

اولاد کا نفقہ

شریعت اسلامیہ نے اولاد کے اخراجات، اس کے ضروریات کی تکمیل اور تعلیم وتربیت کو باپ پر فرض کیا ہے؛ چنانچہ ارشاد ربانی ہے :

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۔ (۳)

اس آیت میں باپ پر ماؤں کے نفقہ کو اولاد کی وجہ سے ضروری قرار دیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بچہ کی وجہ سے ماں کا نفقہ باپ پر لازم کیا گیا ہے تو بچہ کا نفقہ بھی باپ ہی پر لازم ہوگا۔

نیز حدیث شریف میں ہندہ کی شکایت پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ :

خذی ما یکفیک وولدک بالمعروف ۔ (۴)

تمہیں اور تمہاری اولاد کو جتنی مقدار نفقہ کے لئے کافی ہوجائے، اس کے مال میں سے لے لیا کرو۔

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ جس طرح عورت کا نفقہ شوہر کے ذمہ واجب ہے، اسی طرح بچوں کا نفقہ بھی اسی کے سر ہوگا، اگر اولاد کا نفقہ باپ کے ذمہ واجب نہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ہندہ ؓ کو اپنے نفقہ سے زائد لینے کی اجازت مرحمت نہ فرماتے، آپ ﷺ کا اجازت دینا باپ پر اولاد کے نفقہ کے واجب ہونے کی واضح دلیل ہے۔

علاوہ ازیں اولاد باپ ہی کے جز ہیں، پس جس طرح اپنے نفس کی بقا وحفاظت شرعاً ضروری ہے، اسی طرح اپنے اجزاء کی بقا وحفاظت بھی ضروری ہے اور یہ نفقہ کے وجوب کے بغیر متصور نہیں۔(۵)

---

(۱) الاقناع: ۱۴۸/۴، رحمۃ الامۃ: ۳۲۱۔ (۲) شرح مہذب: ۲۹۱/۱۸، رحمۃ الامۃ: ۳۲۱۔ (۳) البقرۃ: ۲۳۳۔

(۴) نسائی عن عائشۃ ؓ: ۳۱۱/۲، باب قضاء الحکم علی الغائب اذا عرفہ، بخاری عن عائشۃ ؓ: ۲۹۴/۱، باب من اجری امر الامصار۔

(۵) بدائع الصنائع: ۳۱/۴۔

یہ واضح رہے کہ صلبی اولاد ہی پر اولاد کا اطلاق نہیں ہوتا؛ بلکہ اس کا اطلاق پوتے پوتیاں، پر پوتے پر پوتیاں اوراس پورے سلسلہ پر ہوتا ہے۔

وجوب نفقہ کی شرطیں

اولاد کے نفقہ کے واجب ہونے کی تین شرطیں ہیں :

اول یہ کہ: وہ محتاج ہواوراس کے پاس مال نہ ہو۔

دوم یہ کہ: وہ بالغ نہ ہوا ہو۔

سوم یہ کہ: آزاد ہوکسی کا غلام نہ ہو۔

اگر یہ شرطیں نہ پائی جائیں تو باپ پر اولاد کا نفقہ واجب نہ ہوگا؛ چنانچہ :

(۱) اگراولاد خود کفیل ہو، اس کے پاس اپنا مال موجود ہوتو باپ پران اولاد کے نفقہ کی ذمہ داری عائد نہ ہوگی: ''حتی لو کان الصغیر غنیا فھی فی مالہ''۔(۱)

(۲) اگرلڑکا بالغ ہوجائے اور وہ خود کمانے پر قادر بھی ہوتو خود تلاش معاش اورکسب رزق کرکے ذاتی ضروریات کی تکمیل اسی کی ذمہ داری ہوگی۔(۲)

(۳) اگر وہ کسی کامملوک اورغلام ہوتواس کا نفقہ باپ پر واجب نہ ہوگا؛ بلکہ اس کے نفقہ کی ذمہ داری آقا پر عائد ہوگی۔(۳)

(۴) اگر وہ نابالغ ہی رہے اورخود کمانے پر قادر نہ ہوتواس کے نفقہ کی ذمہ داری بھی باپ ہی پر عائد ہوگی، یہاں یہ بات ضرور پیش نظر رہے کہ بلوغ کی شرط صرف نرینہ اولاد کے لئے ہے، اگرلڑکیاں ہوں توان کے لئے نکاح کا ہوجانا شرط ہے، اس سے قبل گولڑکیاں بالغ ہوجائیں، پھربھی نفقہ کی ذمہ داری سے باپ شرعاً سبکدوش نہیں ہوگا۔(۴)

کچھ اور مسائل واقسام

(۱) اولاد کے نفقہ کا باپ تنہا ذمہ دار ہوگا، اس میں اس کا کوئی شریک اورحصہ دار نہ ہوگا۔(۵)

---

(۱) درر الحکام: ۱/ ۴۱۸، الفتاوی الہندیہ: ۱/ ۵۶۲۔
(۲) کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ: ۴/ ۵۸۵۔
(۳) البحر الرائق: ۴/ ۲۰۱، درعلی الرد: ۲/ ۲۷۱۔
(۴) الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۷/ ۸۲۴۔
(۵) تاتارخانیہ: ۴/ ۲۳۴، ہندیہ: ۱/ ۵۶۰۔

(۲) باپ مال دار ہونے کے باوجود اپنے بچہ کا نفقہ ادا نہ کرے تو اسلامی عدالت از راہ سزا قید کرسکتی ہے اور بچہ کی ضروریات کی تکمیل پر مجبور کرسکتی ہے۔(۱)

(۳) اگر باپ مالدار نہ ہو اور تنگدست ہو تو اس سے کہا جائے گا کہ کسبِ معاش کرکے اس کے اخراجات برداشت کرے اور اگر وہ کسبِ معاش پر قادر نہ ہو تو نفقہ کی ذمہ داری ماں پر آئے گی — اگر ماں مالدار ہو تو وہ اپنے مال سے اولاد کی کفالت اور پرورش کرے گی اور مالی حالت سدھرنے پر باپ سے نفقہ میں خرچ شدہ مال وصول کرے گی۔(۲)

(۴) اگر ماں بھی مالدار نہ ہو تو اس کے نفقہ کی ذمہ داری دادا پر عائد ہوگی؛ کیوں کہ والدین کے بعد قریب ترین رشتہ دار دادا ہی ہے — گویا باپ تنگدست ہو تو بچہ کی کفالت کی ذمہ داری ''الاقرب فالاقرب'' کے مطابق قرین ترین رشتہ دار کے سر عائد ہوگی اور وہ تمام کے تمام باپ کی مالی حالت بہتر ہونے پر خرچ کی گئی رقم ماں باپ سے وصول کرلیں گے۔(۳)

(۵) اگر باپ کسبِ معاش کے بالکل قابل نہ رہ گیا ہو تو اب نفقہ کی ذمہ داری سے باپ سبکدوش ہوجائے گا اور باپ کے علاوہ جن اشخاص پر نفقہ کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، وہ رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرسکتے، جیسا کہ مرنے کے بعد کفالت قبول کرنے والے مال وصول کرنے کے حقدار نہیں ہوتے ہیں۔(۴)

(۶) یہ تفصیلات اس وقت تھیں جب کہ اولاد کے پاس مال نہ ہو، اگر اولاد کے پاس مال ہو تو نفقہ کا نظم اسی کے مال سے کیا جائے گا، جیسا کہ گذر چکا ہے۔

(۷) اور اگر مال تو ہو لیکن بروقت موجود نہ ہو تو باپ یا دوسرے رشتہ کو یہ کہا جائے گا کہ وہ اخراجات برداشت کرتا رہے اور مال آجائے تو اس سے وصول کرلے۔(۵)

(۸) اگر مال روپئے پیسے کی شکل میں نہ ہو؛ بلکہ جنس کے قبیل سے ہو یا سامان کی صورت غیر منقول ہو اور ضروریات کی تکمیل کے لئے اس کے فروخت کی ضرورت پیش آجائے تو ضروریات کی تکمیل کے لئے باپ ان اشیاء کو فروخت کرسکتا ہے۔(۶)

(۹) اسی طرح نرینہ اولاد بالغ نہ ہوئی ہو؛ البتہ وہ اتنی عمر کو پہنچ چکی ہو کہ وہ خود کسب ومحنت کرکے اپنی

---

(۱) فتاویٰ قاضی خان: ۱/ ۲۲۰، فتاویٰ تاتارخانیہ: ۴/ ۲۳۴۔ (۲) فتح القدیر: ۴/ ۲۱۷۔
(۳) بدائع الصنائع: ۴/ ۳۶۔ (۴) حوالۂ سابق، کتاب الفقہ: ۴/ ۵۸۶۔
(۵) المبسوط للسرخسی: ۵/ ۲۲۳۔ (۶) البحر الرائق: ۴/ ۲۰۱۔

ضروریات پوری کرلے تو باپ اس کو کسی کام میں لگادے گا؛ تا کہ وہ ان کی کمائی ہوئی اُجرت ومزدوری اور تنخواہ ومشاہرہ سے ان کی ضروریات پوری کرسکے۔

پس اگر باپ کے حکم کے مطابق اولاد نے کسب معاش کیا تو باپ ان کے مال سے ان کی ضروریات پوری کرے گا اور بچا ہوا مال بلوغ کے بعد واپس کردے گا؛ لیکن باپ فضول خرچ ہو اور بچا ہوا مال ہڑپ کر جانے کا اندیشہ ہو تو قاضی اس سے مال لے کر کسی امانت دار شخص کو دیدے گا اور وہ مال اسی کے پاس رہے گا؛ تا آں کہ وہ خود بالغ ہوجائیں۔(۱)

(۱۰) البتہ اگر والدین خود محتاج ہوں تو وہ بقدر ضرورت ان کے مال میں سے اپنی ضروریات کے لئے لے سکتے ہیں۔(۲)

(۱۱) اسی طرح گو ماں اس کی مطلقہ کیوں نہ ہو، پھر بھی اس کو اس کے مال سے بقدر اخراجات استفادہ کا حق حاصل ہے۔(۳)

(۱۲) اور اگر یہ لوگ شرفاء کے خاندان اور اونچے گھرانے سے تعلق رکھتے ہوں کہ مزدوری کرنا ان کے لئے شرافت خاندانی کے خلاف اور ننگ وعار کا باعث سمجھا جاتا ہو تو گو یہ بالغ ہوجائیں، پھر بھی ان کا نفقہ والدین ہی کے ذمہ ہوگا۔(۴)

(۱۳) اسی طرح اگر کوئی طالب علم ہو اور تحصیل علم میں مصروفیت کی بنا پر خود ہی اپنی ضروریات کی تکمیل کا موقع نہ ملتا ہو یا موقع ملے؛ لیکن کسبِ معاش کے طریقوں سے واقف نہ ہو تو نفقہ واخراجات کا بار والدین ہی پر رہے گا اور بالغ ہونے کے باوجود ان کے ذمہ سے نفقہ ساقط نہ ہوگا۔(۵)

طالب علموں کے نفقات کے بارے میں علامہ شامی نے صاحب قنیہ کی ایک عجیب بات نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ :

> چوں کہ ان میں اکثر اخلاقِ حسنہ والے اور علوم دینیہ میں مشغول رہنے والے بہت ہی کم ہوتے ہیں، اکثر فاسق وگنہگار ہوتے ہیں، ان کی برائی بھلائی سے زیادہ ہوتی ہے، وہ اختلافی مسائل کے درس میں شریک ہوتے ہیں، جو دین کے لئے مفید ہونے کی بجائے ضرر رساں ثابت ہیں، علاوہ ازیں دن کے اکثر اوقات میں مذاق، غیبت وغیرہ

(۱) البحر الرائق: ۴/۲۰۲۔
(۲) بدائع الصنائع: ۴/۳۰۔
(۳) حوالہ سابق۔
(۴) مجمع الانہر: ۱/۵۰۰۔
(۵) البحر الرائق: ۴/۲۲۸۔

ہی ان کا مشغلہ ہوتا ہے، جو خدا کی لعنت اور ان کی ناراضگی کا سبب بنتے ہیں، نتیجتاً اللہ بھی ان کے دل میں نفرت اور بغض ڈال دیتے ہیں، شفقت و رحمت چھین لیتے ہیں؛ چنانچہ وہ کھانے کپڑے کی اشیاء کا مطالبہ کرتے ہیں اور مطالبہ نہ پورا کیا جائے تو وہ انھیں تکلیف پہنچاتے ہیں، جو کہ شرعاً حرام ہے، اس لئے میں اب یہ فتویٰ دیتا ہوں کہ والدین پر طالب علموں کے نفقات واجب نہیں ہیں۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ :

اگر سلف کو ان کی اس حالت کا علم ہو جاتا تو ان پر خرچ کرنے کو حرام قرار دیتے اور والدین پر ان کے اخراجات کی تکمیل کو واجب قرار نہ دیتے۔

لیکن اتنی خفگی کے باوجود بعد میں انھوں نے اپنے فتویٰ سے رُجوع کرلیا ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

لیکن عام فتنہ(۱) کے بعد بھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ فقہ اور ادب جو قواعد دینیہ اور کلامِ عرب کے اُصول ہیں، کی تحصیل میں مشغول رہتے ہیں اور اگر کما کر اپنی ضروریات پوری کرنے کا حکم دیا جائے تو کمانے میں مشغول ہونا تحصیل علم کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے؛ جب کہ یہ علم کے ضائع ہوجانے کا بڑا سبب بن جاتا ہے، اس لئے اب طالب علموں کے اخراجات کے بارے میں سلف ہی کا قول پسندیدہ اور قابل عمل ہے۔(۲)

معلوم ہوا کہ طالب علموں کے اخراجات کی ذمہ داری باپ ہی پر ہے۔

(۱۴) اسی طرح ان بالغ اولاد کا نفقہ بھی باپ ہی کے ذمہ ہوگا، جو چلنے سے معذور ہوں یا کوئی ایسا عیب یا مرض ہو، جس کی وجہ سے خود کمانے سے عاجز ہوں۔(۳)

(۱۵) اگر لڑکیاں کمانے پر قادر ہوں تو لڑکوں کی طرح ان کو کمانے اور اخراجات کی کفالت کے لئے مجبور نہیں کیا جاسکتا؛ کیوں کہ اس کے لئے غیر محرموں سے واسطہ پڑنا ناگزیر ہے اور ظاہر ہے یہ فتنہ سے خالی نہیں اور اسلام نے اس سے منع کیا ہے۔(۴)

---

(۱) فتنۂ عام سے مراد تاتاریوں کا فتنہ ہے، جس میں بے شمار علماء اسلام تہہ تیغ کردیئے گئے تھے، شامی: ۲/ ۶۷۲۔

(۲) مجمع الانہر: ۱/ ۴۶۶، جامع الرموز: ۱/ ۳۵۶، ۳۵۷، ردالمحتار: ۲/ ۲۷۲۔

(۳) تاتارخانیہ: ۴/ ۲۴۱۔

(۴) الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۷/ ۲۴۷۔

(۱۶) البتہ اگر کوئی ایسا کام ہو جس سے اجنبیوں اور غیر محرموں سے فتنوں کا اندیشہ نہ ہو، مثلاً سلائی، کڑھائی اور بنائی کا کام وغیرہ تو ان کا نفقہ باپ کے سر نہ ہوگا (۱)؛ کیوں کہ ان کاموں میں غیر محرموں سے نہ بے حجابانہ ملاقات کی نوبت آتی ہے اور نہ فتنہ کا اندیشہ ہوتا ہے؛ لیکن اگر ان کی اپنی آمدنی اخراجات کے لئے کافی نہ ہوں تو حسب ضرورت نفقہ باپ ہی کے ذمہ ہوگا۔(۲)

(۱۷) لڑکیوں کی شادی کے بعد نفقہ کی ذمہ داری شوہر پر عائد ہوتی ہے اور اگر طلاق واقع ہو جائے تو نفقہ کی ذمہ داری باپ ہی پر ہوگی؛ البتہ اگر سلائی کڑھائی وغیرہ کے ذریعہ اپنی کفالت آپ کرسکتی ہوں تو باپ سے نفقہ کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔(۳)

اولاد کا نفقہ کس پر واجب ہے؟

اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ باپ موجود ہو، مالدار ہو، کسبِ معاش پر قادر ہو تو اولاد کا نفقہ صرف اسی پر واجب ہوگا اور اس میں اس کا کوئی شریک نہ ہوگا؛ لیکن اگر باپ نہ ہو، یا فقیر ہو، یا کسی سبب سے کمائی پر قادر نہ ہو تو اولاد کا نفقہ ماں اور اوپر کے رشتہ داروں دادا وغیرہ پر واجب ہوگا، بشرطیکہ وہ سب مالدار بھی ہوں۔(۴)

اسی طرح اگر باپ موجود نہ ہو اور دادا، ماں دونوں موجود ہوں تو اولاد کا نفقہ ان کی میراث کے مطابق ان دونوں پر واجب ہوگا، یعنی اولاد کے ترکہ میں سے ان دونوں کو جس حساب سے میراث ملتی، اسی لحاظ سے نفقہ واجب ہوگا، پس ماں پر نفقہ تہائی حصہ اور دادا پر نفقہ کے دو تہائی حصہ کی ذمہ داری ہوگی اور ماں نہ ہو؛ بلکہ ماں کے بجائے نانی ہو تو نانی پر نفقہ کا (۱/۶) حصہ اور دادا پر نفقہ کا بقیہ حصہ ادا کرنا ضروری ہوگا، اسی طرح دادا کے ساتھ نانی اور دادی دونوں موجود ہوں تو نانی اور دادی پر نفقہ کا چھٹا حصہ (نصف نصف) واجب ہوگا اور دادا نفقہ کے بقیہ حصہ کا ذمہ دار ہوگا۔

یہ تفصیلات اس وقت ہیں جب کہ رشتہ دار وارثین میں سے ہوں اور اگر رشتہ دار وارثین میں سے نہ ہوں تو ان میں قریب ترین رشتہ دار پر نفقہ کی ذمہ داری عائد ہوگی اور اگر قرابت میں سبھی مساوی ہوں تو سبھوں پر مساویانہ طور پر نفقہ کی ذمہ داری عائد ہوگی۔

اگر بعض رشتہ دار وارثین میں سے ہوں اور بعض وارثین میں سے نہ ہوں تو سب سے قریب ترین رشتہ دار کے سر نفقہ واجب ہوگا، چاہے وہ غیر وارث ہی کیوں نہ ہوں اور اگر یہاں بھی وارثین وغیر وارثین سبھی رشتہ میں برابر ہو جائیں تو صرف وراثت پانے والے ہی پر نفقہ واجب ہوگا، دوسروں پر نہیں۔(۵)

---

(۱) الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۷/ ۸۲۴۔ (۲) حوالہ سابق۔ (۳) حوالہ سابق۔
(۴) حوالہ سابق: ۷/ ۸۲۶۔ (۵) حوالہ سابق۔

دیگر فقہاء کی رائیں

(۱) مالکیہ کے نزدیک اولاد کے نفقہ کی ذمہ داری صرف باپ ہی کے سر عائد ہوگی، دوسرے پر نہیں۔(۱)

(۲) حنابلہ کے نزدیک باپ کی عدم موجودگی میں اولاد کے نفقہ کے ذمہ دار تمام ہی ورثاء ہوں گے اور سبھی باہم مل کر اس کے اخراجات برداشت کریں گے۔

(۳) شوافع کے یہاں باپ موجود نہ ہو یا نفقہ سے عاجز ہو تو نفقہ ماں پر ہی واجب ہوگا، اگر ماں نہ ہو اور دوسرے رشتہ دار موجود ہوں تو یہ دیکھا جائے کہ تمام رشتہ دار درجہ میں مساوی ہیں یا تفاوت اور فرق ہے؟ اگر درجہ میں سبھی برابر ہوں تو نفقہ تمام رشتہ دار پر برابر واجب ہوگا؛ لیکن اگر درجہ میں فرق ہو، بعض قریب ہوں اور بعض دُور تو قریب ترین رشتہ دار پر نفقہ واجب ہوگا اور درجہ میں بھی سبھی برابر ہوں تو وراثت پانے والوں پر نفقہ واجب ہوگا۔(۲)

نفقہ کی مقدار

جیسا کہ گذر چکا ہے کہ نفقات میں نہ صرف کھانا، کپڑا اور سامانِ رہائش شامل ہے؛ بلکہ کھانے کے لوازم سالن، صابن، تیل اور علاج بھی شامل ہے اور نفقات کی ادائیگی میں جہاں شہر کے عرف کو دیکھا جائے گا کہ اس طبقہ سے تعلق رکھنے والے کس قسم کے کھانے کپڑے وغیرہ استعمال کرتے ہیں، وہیں نفقہ کے ذمہ دار کے حالات کو بھی پیش نظر رکھا جائے گا۔

اسی طرح نفقات کا بار اُٹھانے والے پر اتنی مقدار ہی میں نفقہ واجب ہوگا جو کافی ہو؛ کیوں کہ نفقہ کا وجوب بر بناء ضرورت ہے اور جن چیزوں کا ثبوت بر بناء ضرورت ہو، وہ ضرورت کی مقدار ہی میں ثابت ہوتی ہیں، اس لئے نفقہ اتنی ہی مقدار میں واجب ہوگا جس سے ضرورت پوری ہوجائے، اس کے علاوہ حضرت ہندہؓ کی شکایت پر رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان کے مال سے مقدار کفایت ہی لینے کی اجازت دی تھی، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نفقہ کی وہی مقدار واجب ہے، جو کافی ہوجائے۔

اسی وجہ سے اگر اولاد کو خادم کی ضرورت محسوس ہو تو باپ پر ضروری ہے کہ خادم ونوکر اس کی خدمت کے لئے مہیا کردے کہ بعض لوگوں کے لئے نوکر کا رکھنا بھی مقدار کفایت میں سے ہے؛ لیکن اگر اولاد شادی شدہ ہو تو ان کی بیوی کا نفقہ باپ پر لازم نہیں ہے؛ بلکہ اولاد ہی پر ہوگا۔

یہ ضرور ذہن نشیں رہے کہ باپ پر اولاد کا نفقہ اس حیثیت سے واجب نہیں ہوتا کہ ادا نہ کرنے پر قرض شمار ہوگا؛ بلکہ تبرع وصلہ بن کر واجب ہوگا اور جیسے ہی نفقہ کا وقت ختم ہوگا، اس کے ذمہ سے ساقط ہوجائے گا۔

---

(۱) نیل الاوطار: ۲۲/۶۔ (۲) الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۸۲۷/۷۔

شیر خوار بچہ کی رضاعت کا مسئلہ

نفقات کے سلسلہ میں یہ تمام تفصیلات ان اولاد کے لئے تھیں جو شیر خوارگی کے ایام کو پار کر چکے ہوں اور ان کی مدت رضاعت ختم ہوگئی ہو اور اگر اولاد میں شیر خوار بچے ہوں تو دودھ پلانے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی؟

اس سلسلہ میں فقہاء احناف کا اتفاق ہے کہ بچہ کے دودھ پلانے کا انتظام کرنا باپ کی ذمہ داری ہے، ماں کی نہیں؛ اسی لئے بچہ کی پیدائش کے بعد باپ کی ذمہ داری ہے کہ دودھ پلانے والی دایہ کا نظم کرے، چاہے اُجرت دے کر ہی کیوں نہ ہو؛ کیوں کہ دودھ پلانا بھی نفقہ میں شامل ہے، پس جس طرح غیر شیر خوار بچوں کے اخراجات کی ذمہ داری باپ کے سر آتی ہے، اسی طرح شیر خوار بچوں کے دودھ پلانے کا انتظام کرنا بھی باپ ہی کے ذمہ ہوگا، اگر دودھ پلانے والی عورت مل جائے، وہ بچہ اس کا دودھ پیتا بھی ہو اور اس کے پاس مال بھی نہ ہو تو باپ اپنی طرف سے دایہ کو دودھ پلانے کے لئے بطور اُجرت متعین کردے گا؛ تاکہ بچہ کی نشوونما ہو اور اگر اس کے پاس مال ہو تو دایہ کی اُجرت اسی کے مال سے دی جائے گی، باپ کو حق نہیں کہ بچہ کی ماں کو دودھ پلانے پر مجبور کرے، (۱) اور اگر بچہ دوسرے کا دودھ پیتا ہی نہ ہو تو شمس الائمہ حلوانی فرماتے ہیں کہ ماں کو اس صورت میں بھی مجبور نہیں کیا جاسکتا؛ لیکن شمس الائمہ سرخسی فرماتے ہیں کہ ماں کو دودھ پلانے پر شرعاً مجبور کیا جاسکتا ہے، (۲) یہی مذہب امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کا ہے (۳) اور اسی پر فتویٰ بھی ہے۔

اسی طرح اگر کوئی دودھ پلانے والی عورت نہ مل سکی تو اب بھی ماں کو دودھ پلانے پر مجبور کیا جائے گا اور ماں کو دودھ پلانے کی اُجرت لینا درست نہ ہوگا، بشرطیکہ ماں اس کے نکاح میں بھی ہو، یا مطلقہ رجعیہ ہو؛ (۴) لیکن اگر ماں مطلقہ بائنہ یا مغلظہ ہو اور عدت میں ہو تو مفتیٰ بہ قول کے مطابق وہ اُجرت لے سکتی ہے۔ (۵)

اگر مرضعہ سے عقد اجارہ میں بچہ کے گھر پر ہی رہنے کی شرط نہ لگائی گئی ہو تو ہر وقت بچہ کے پاس رہنا اس پر ضروری نہ ہوگا، (۶) اسی طرح اگر بچہ کی ماں کے پاس ہی دودھ پلانے کی شرط نہ لگائی گئی ہو تو مرضعہ کو اپنے گھر لے جا کر دودھ پلانے کا اختیار ہوگا؛ (۷) لیکن اگر ماں کے پاس ہی دودھ پلانے کی شرط لگا دی گئی ہو تو ماں ہی کے پاس دودھ پلانا ضروری ہوگا۔ (۸)

---

(۱) الفتاویٰ الہندیہ: ۱/ ۵۶۰، فتاویٰ قاضی خاں: ۱/ ۴۴۵۔ (۲) الفتاویٰ الہندیہ: ۱/ ۵۶۰۔
(۳) الفتاویٰ الہندیہ: ۱/ ۵۶۰۔ (۴) تاتارخانیہ: ۴/ ۲۳۴، فتح القدیر: ۴/ ۲۱۸۔
(۵) قاضی خاں: ۱/ ۴۴۶۔ (۶) حوالۂ سابق۔
(۷) الفتاویٰ الہندیہ: ۱/ ۵۴۲۔ (۸) تاتارخانیہ: ۴/ ۲۳۵۔

اگر عقد اجارہ کے وقت صرف ایک ماہ دودھ پلانے کی بات طے ہوئی تھی اور ایک ماہ کے بعد مدت مکمل ہونے پر دودھ پلانے سے انکار کرنے لگی اور بچہ بھی اس کے علاوہ کسی کا دودھ نہ پیتا ہوتو اسے مزید دودھ پلانے پر شرعاً مجبور کیا جاسکتا ہے؛ تاکہ بچہ کی جان خطرہ میں نہ پڑ جائے ،(۱) واضح رہے کہ یہ تمام احکام قضاء کے اعتبار سے ہیں، ورنہ دیانت کا حکم یہ ہے کہ ماں خود ہی اپنے شیر خوار بچہ کو دودھ پلائے ۔(۲)

والدین کا نفقہ

قرآن کریم نے والدین کی جو اہمیت اور وقعت مسلمانوں کے دل میں بٹھائی ہے، کتب سماویہ میں اس کی مثال بہت کم ملتی ہے؛ چنانچہ اللہ کے ساتھ شریک قرار دینے سے منع کرنے اور توحید کے اقرار کے بعد جو حکم دیا گیا ہے وہ والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کا ہے، فرمایا گیا :

وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۔(۳)

ماں باپ کے حق کے مؤکد ترین ہونے کی وجہ سے قرآن نے جہاں حسن اخلاق سے پیش آنے، حسن سلوک کرنے اور شیریں گفتگو کرنے کا حکم دیا ہے، وہیں مارنا تو درکنار، ڈانٹ ڈپٹ کرنے اور جھڑکنے سے بھی سختی سے روکا ہے۔

اسی لئے متقدمین ومتاخرین علماء اور فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ والدین کے نفقہ واخراجات کی تکمیل اولاد پر واجب ہے؛ کیوں کہ آیات قرآنیہ میں ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور حسن سلوک صرف یہی نہیں کہ ان سے اچھے اور باادب ہوکر پیش آیا جائے، گفتگو میں نرم انداز اختیار کیا جائے؛ بلکہ حسن سلوک یہ بھی ہے کہ ان کے اخراجات برداشت کئے جائیں اور ان کی ضرورتیں پوری کی جائیں، نیز کافر والدین کے بارے میں فرمایا گیا :

وَ صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۔ (۴)

جب کافر والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا واجب قرار دیا گیا تو مومن والدین کے ساتھ بھلائی سے پیش آنا بدرجۂ اولیٰ واجب ہوگا اور ایک مومن کو یہ زیب بھی نہیں دیتا کہ خود تو آسودہ حال ہوکر رہے اور اس کے والدین فاقہ مستی کی تنگ زندگی گزار رہے ہوں۔

---

(۱) الفتاویٰ الہندیہ:۱/۵۶۱۔ (۲) البحر الرائق:۴/۲۰۲۔
(۳) بنی اسرائیل:۲۳۔ (۴) لقمان:۱۵۔

علاوہ ازیں خود نبی اکرم ﷺ نے فرمایا :

ان اطیب ما اکلتم من کسبکم و ان اولادکم من کسبکم فکلوہ هنیئاً مریئاً ۔ (١)

تمہارا سب سے پاکیزہ رزق وہ ہے، جو تم اپنی محنت سے کماؤ اور تمہاری اولاد تمہاری کمائی ہے۔

ایک اور موقع پر ایک شخص کے اس سوال پر کہ میری خدمت کے مستحق کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا :

امک ثم امک ثم امک ثم ابوک ثم الاقرب فالاقرب ۔ (٢)

تمہاری ماں ،تمہاری ماں ،تمہاری ماں ، پھر تمہارے باپ ، پھر وہ جو درجہ بدرجہ قریب ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے ارشادات سے بھی یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ ماں باپ کے نفقات واخراجات کی ذمہ داری اولاد پر عائد ہوتی ہے، نیز باپ ہی کے حکم میں اُصولی رشتہ دار، آباء واجداد، مائیں اور دادیاں ہیں، یہی وجہ ہے کہ باپ موجود نہ ہو تو دادا اس کا قائم مقام ہوا کرتا ہے۔(٣)

وجوب نفقہ کے شرائط

فقہاء نے والدین اور اُصولی رشتہ داروں کے نفقات کو دوسروں پر واجب ہونے کی چند شرطیں بھی ذکر کی ہیں۔

اول یہ کہ والدین محتاج ہوں ،خواہ وہ کمانے سے عاجز ہوں یا اس پر قادر، ان کے اخراجات کی ذمہ دار اولاد ہی ہوگی ؛(٤) کیوں کہ اسلام نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور اخلاق فاضلہ سے پیش آنے کی تعلیم دی ہے، اگر ان کے لئے کسبِ معاش کرنا ضروری قرار دیا جائے تو یہ حسن سلوک نہیں ، بدسلوکی ہوگی ، انھیں ایذا اور تکلیف پہنچانا ہوگا ،جس کی شریعت نے بالکل اجازت نہیں ہے، نیز ایک صاحب ایمان کو سزاوار نہیں کہ مالی حالت بہتر ہونے کے باوجود اپنے ماں باپ یا دادا وغیرہ کو خود کسبِ معاش کر کے اپنی ضرورت پوری کرنے پر مجبور کردے ،(٥) بخلاف اولاد کے کہ اگر وہ کمانے پر قادر ہوں تو باپ ان کے نفقہ کا ذمہ دار نہ ہوگا ،خود کما کر اپنی ضرورتوں کی تکمیل کرنی ہوگی ۔(٦)

---

(١) سنن الترمذی، حدیث نمبر: ١٣٥٨۔ (٢) ابوداؤد، عن جهز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ: ٦٩٩/٢، باب فی برالوالدین۔

(٣) البحر الرائق: ٢٠٥/٤، ہدایہ: ٤٢٦/٢، تاتارخانیہ: ٢٥٢/٤۔ (٤) فتح القدیر: ٣٢٠/٣۔

(٥) الفقہ الاسلامی وادلتہ: ٨٣١/٧۔ (٦) فتح القدیر: ٢١٧/٣۔

امام شافعیؒ کی بھی یہی رائے ہے؛(۱) لیکن امام مالک اور امام احمد کے ہاں والدین کسبِ معاش پر قادر ہوں تو اولاد پر ان کا نفقہ واجب نہیں ہوگا۔(۲)

دوم یہ کہ اولاد مالدار ہو، یا کم از کم کمانے پر قدرت رکھتی ہو اور مال ان کی ضرورت سے زائد بھی ہو، اگر ان کے پاس صرف اپنی ضرورت کے بقدر مال ہو، اس سے زائد نہ ہو تو نفقہ کی ذمہ داری ان پر عائد نہ ہوگی؛ (۳) کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے سب سے پہلے اپنی ذاتی ضرورت پوری کرنے کی تعلیم دی ہے، اگر اس سے زائد ہو تو اپنے اہل وعیال اور قرابت داروں پر خرچ کرنے کی تعلیم دی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ :

ابدأ بنفسک ثم بمن تعول ۔ (۴)

پہلے اپنی ذات سے شروع کرو، پھر وہ جن کی تم پرورش کرتے ہو۔

ایک اور موقع پر مزید وضاحت سے فرمایا کہ :

اذا کان احدکم فقیراً فلیبدأ بنفسه فان فضل فعلیٰ عیاله فان کان فضل فعلی قرابته ۔ (۵)

اگر تم میں سے کوئی محتاج ہو تو خرچ کرنے میں اپنے آپ سے شروع کرے، پھر اس سے زائد ہوجائے تو اپنی اولاد پر خرچ کرے اور اس سے بھی بچ جائے تو اپنے دوسرے رشتہ داروں پر خرچ کرے۔

معلوم ہوا کہ اپنے خرچ سے مال زائد نہ ہو تو والدین کے نفقہ کی ذمہ داری اولاد پر عائد نہیں ہوتی۔

سوم یہ کہ اُصولی قرابت دار وراثت کے حقدار بھی ہوتے ہوں؛ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وراثت کی طرح اختلاف دین کی وجہ سے باپ یا اُصولی رشتہ دار نفقہ سے محروم ہوجائے گا؛ بلکہ نفقہ میں اختلاف دین اثر انداز نہیں ہوتا؛ چنانچہ اگر باپ مسلم اور بیٹا کافر ہو یا بیٹا مسلم اور باپ کافر ہو، پھر بھی ان کا نفقہ ایک دوسرے پر واجب ہوگا۔(۶)

نفقہ کے متعلق مسائل

(۱) اگر بیٹی یا بیٹوں میں سے کوئی ایک ہی ہو تو موجود ہو، باپ کے نفقہ کا صرف وہی ذمہ دار ہوگا اور اگر کئی

(۱) کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ: ۴/ ۵۹۳۔
(۲) کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ: ۴/ ۵۹۲-۵۹۳۔
(۳) کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ: ۴/ ۵۹۰۔
(۴) نسائی: ۱/ ۳۵۳، باب ای الصدقۃ افضل۔
(۵) نسائی: ۲/ ۲۲۹، باب بیع المدبر۔
(۶) الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۷/ ۸۳۲۔

ہوں اور سبھی رشتہ ودرجہ میں برابر ہوں تو مساویانہ طور پر سبھوں پر نفقہ کی ادائیگی واجب ہوگی، مثلاً دو بیٹے ہوں، یا دو لڑکیاں ہوں یا ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہو تو چوں کہ سبھی باپ سے قرابت میں یکساں ہیں، اس لئے ان تمام پر یکساں نفقہ واجب ہوگا۔(۱)

(۲) اگر باپ فقیر ہو، اس کے بیٹے مالدار ہوں، ان میں سے بعض مال کے اعتبار سے اعلیٰ طبقہ میں شمار ہوتا ہو اور دوسرا صرف نصابِ زکوۃ کے بقدر مال کا مالک ہو تو بھی دونوں پر برابر نفقہ واجب ہوگا، ایسا نہیں ہوگا کہ زیادہ مالدار شخص پر زیادہ نفقہ اور کم مالدار پر کم نفقہ واجب ہو۔(۲)

(۳) لیکن اگر قرابت میں مساوی نہ ہوں؛ بلکہ بعض قریب اور بعض بعید ہوں تو قریب پر نفقہ کی ذمہ داری عائد ہوگی، مثلاً بیٹی اور پوتا ہو تو بیٹی پر نفقہ واجب ہوگا؛ کیوں کہ وہی زیادہ قریب ہے،(۳) اسی طرح اگر بیٹی اور حقیقی بہن ہو تو بھی بیٹی ہی پر نفقہ عائد ہوگا کہ وہی بہن کے مقابلہ زیادہ قریب ہے۔

(۴) اگر کسی کا باپ بھی باحیات ہو اور بیٹا بھی تو باوجودیکہ دونوں رشتہ میں برابر ہیں، پھر بھی فرمان نبوی ''انت ومالک لابیک'' کے پیش نظر بیٹے ہی پر نفقہ کی ذمہ داری عائد ہوگی، (۴) گویا قرابت میں تفاوت ہونے کی صورت میں زیادہ قریب کو نفقہ کا ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔

(۵) لیکن اگر قریبی رشتہ دار تنگدست ہو تو نفقہ اس کے بعد کے قریبی رشتہ دار پر واجب ہوگا، مثلاً کسی کا بیٹا اور پوتا موجود ہو، بیٹا تنگدست ہو تو پوتے پر نفقہ کی ذمہ داری آئے گی؛ کیوں کہ بیٹے کے بعد وہی قریب ہے۔(۵)

(۶) کسی کے دو بیٹے ہوں، ان میں سے ایک باپ کا نفقہ ادا کرنے سے انکار کررہا ہو اور دوسرا نفقہ دینے کو تیار ہو تو دوسرا اپنے باپ کا مکمل خرچ برداشت کرے گا، پھر اپنے حصہ سے زائد دوسرے بھائی سے وصول کرلے گا۔(۶)

(۷) اگر کوئی شخص اپنی سوتیلی ماں کا نفقہ دینے سے انکار کررہا ہو تو اس کو نفقہ دینے پر شرعاً مجبور نہیں کیا جاسکتا، گو باپ تنگدست ہو اور اس کی سوتیلی ماں کا نفقہ دینے پر قادر نہ ہو، (۷) بخلاف حقیقی ماں کے کہ اگر وہ محتاج ہو اور معذور نہ بھی ہو، پھر بھی اولاد کے ذمہ نفقہ کی ادائیگی واجب ہوگی۔(۸)

---

(۱) تاتارخانیہ: ۴/۲۴۷، الفتاویٰ الہندیہ: ۱/۵۶۴۔ (۲) قاضی خاں: ۱/۴۴۸۔
(۳) کتاب الفقہ: ۴/۵۸۹، تاتارخانیہ: ۴/۲۵۰۔ (۴) کتاب الفقہ: ۴/۵۸۹۔
(۵) کتاب الفقہ: ۴/۵۸۹۔ (۶) الفتاویٰ الہندیہ: ۱/۵۶۵۔
(۷) تاتارخانیہ: ۴/۲۴۸۔ (۸) الفتاویٰ الہندیہ: ۱/۵۶۵۔

(۸) اگر کوئی شخص والدین میں کسی ایک ہی کے اخراجات برداشت کرنے کی وسعت رکھتا ہوتو ماں نفقہ کی زیادہ مستحق ہوگی۔(۱)

(۹) اگر کسی کے باپ اور بیٹے دونوں موجود ہوں اور وہ ان میں سے صرف ایک ہی کا نفقہ برداشت کرسکتا ہوتو بیٹا نفقہ کا زیادہ حقدار ہوگا۔(۲)

(۱۰) اگر کسی کی چند اولاد ہو، ان میں سے بعض بڑے اور بعض چھوٹے ہوں، بڑے مالدار ہوں اور باپ محتاج وتنگدست ہو کہ چھوٹے بچوں کا نفقہ دینے سے عاجز ہوتو بڑے بچوں پر باپ کے نفقہ کی ذمہ داری تو عائد ہوگی ہی، چھوٹے بچوں کے نفقات بھی اسی کے سر ہوں گے۔(۳)

(۱۱) اسی طرح اگر کسی کا باپ ہاتھ پاؤں سے معذور ہوتو اپنے اہل وعیال کے ساتھ ساتھ باپ کا نفقہ بھی اسی کے ذمہ ہوگا۔(۴)

(۱۲) لیکن اگر اس کی اپنی آمدنی سے باپ کے خرچ کے لئے کچھ بھی نہ بچ پاتا ہو، پورا مال اولاد ہی میں صرف ہوجاتا ہو، پھر بھی باپ کا نفقہ اپنے اہل وعیال کے نفقہ سے کاٹ کردینا ہوگا، گویا یہاں باپ کو اولاد کے ساتھ نفقہ میں شامل کرلینے کی وجہ سے آسودہ ہوکر نہیں کھاسکیں گے؛ لیکن اس سے جان تو نہیں چلی جائے گی۔(۵)

(۱۳) اگر کوئی شخص معذور اور اپاہج ہوتو اپنی بیوی اور نابالغ ومحتاج اولاد کے نفقہ ادا کرنے پر مجبور تو کیا جائے گا؛ لیکن ماں باپ اور بالغ اولاد کے نفقہ ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔(۶)

(۱۴) اگر کوئی شخص محنت کرکے یومیہ اتنا کما لیتا ہو کہ اس کے اپنے اہل وعیال کی ضرورتوں سے فاضل بھی ہوجاتا ہو اور اس کا باپ تنگدست ہوتو ایسے شخص پر بچا ہوا مال باپ کی ضروریات میں خرچ کرنا ضروری ہے۔(۷)

(۱۵) والدین کے نفقہ کے باب میں یہ بھی پیش نظر رہے کہ اولاد پر صرف نفقہ یعنی خوراک، پوشاک اور رہائش کا نظم کرنا ہی واجب نہیں؛ بلکہ اس سے بڑھ کر اگر والدین کو نوکر کی ضرورت بھی پیش آجائے اور انھیں اس کی وسعت ہوتو اولاد پر نوکر رکھنا بھی واجب ہوگا،(۸) یہاں تک کہ جمہور فقہاء کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر باپ کے عفت وپاکدامنی پر داغ آنے کا اندیشہ ہوجائے تو عفت وعصمت کے دامن کو تارتار ہونے سے بچانے کے لئے بیٹے پر

---

(۱) الفتاویٰ الہندیہ: ۱/ ۵۶۵۔ (۲) الفتاویٰ الہندیہ: ۱/ ۵۶۵۔

(۳) الفتاویٰ الہندیہ: ۱/ ۵۶۵۔ (۴) قاضی خاں: ۱/ ۴۴۸۔

(۵) فتح القدیر: ۴/ ۲۲۳۔ (۶) قاضی خاں علی الہندیہ: ۱/ ۴۴۸۔

(۷) قاضی خاں علی الہندیہ: ۱/ ۴۴۸۔ (۸) تاتارخانیہ: ۴/ ۴۲۸۔

باپ کی شادی کرانا بھی واجب ہے اور فقہاء مالکیہ اور حنابلہ کے یہاں تو ایک سے ضرورت پوری نہ ہو تو ایک سے زائد شادی کرانا بھی واجب ہے۔(۱)

لیکن حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ شادی کرانا واجب نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ لذت سے تعلق رکھنے والے اُمور میں سے ہے اور لذت والی چیزیں مثلاً: حلوہ وغیرہ نفقہ میں دینا واجب نہیں، پس اسی طرح نکاح کرانا بھی واجب نہیں ہوگا۔(۲)

(۱۶) اگر باپ اور بیٹے میں اس مسئلہ میں اختلاف ہوجائے کہ باپ نفقہ کا مستحق ہے یا نہیں؟ بیٹا کہتا ہے کہ میرا باپ مالدار ہے، اس لئے ان کا نفقہ مجھ پر لازم نہیں ہے اور باپ کہتا ہے کہ میں تنگدست ہوں، اس لئے میرا نفقہ میرے بیٹے پر واجب ہونا چاہئے، تو بیٹے سے گواہ طلب کیا جائے گا، اگر گواہ باپ کے خوشحال ہونے کی شہادت دیں تو نفقہ واجب نہیں ہوگا اور اگر گواہ اس کی تصدیق نہ کرے تو نفقہ اس پر واجب ہوگا۔(۳)

(۱۷) یہ تفصیلات باپ کے نفقہ کے بارے میں ہے، اگر ان کے بجائے دادا ہو اور باپ باحیات نہ ہو یا بقید حیات ہو؛ لیکن محتاج ہو تو جس طرح باپ کا نفقہ اولاد کے ذمہ ہوگا، اسی طرح دادا کے نفقہ کے ذمہ دار بھی وہی اولاد ہوں گے، بشرطیہ وہ تنگدست ہو اور کسب معاش پر قادر نہ ہو۔(۴)

(۱۸) اگر وہ تنگدست نہ ہو یا کسبِ معاش پر قادر ہو تو پوتوں پر دادا کا نفقہ واجب نہ ہوگا، بخلاف ماں باپ کے کہ گو وہ کسب معاش پر قادر ہوں، پھر بھی نفقہ اولاد ہی کے ذمہ ہوگا۔(۵)

(۱۹) پدری اجداد (باپ کی طرف سے ہونے والے دادا) کے حکم کی طرح مادری اجداد کا بھی ہوگا کہ باپ کے باحیات نہ ہونے یا محتاج ہونے کی صورت میں ان کے نفقہ کی بھی ذمہ داری اولاد (نواسوں) ہی کے سر ہوگی۔(۶)

(۲۰) دادا کے نفقات کے باب میں یہ ضرور پیش نظر رہے کہ باپ کی وفات ہوچکی ہو تب تو کسی رکاوٹ کے بغیر دادا باپ کے قائم مقام ہوجائے گا؛ لیکن باپ باحیات ہو تو دادا کے نفقہ کے لئے باپ کو میت کے حکم میں اسی وقت رکھا جائے گا، جب کہ وہ محتاج بھی ہو، باپ محتاج نہ ہو تو میت کا حکم لگا کر دادا کو اس کے قائم مقام کرنا درست نہ ہوگا۔(۷)

• • •

(۱) حلیۃ العلماء: ۷/ ۴۲۹، شرح مہذب: ۱۸/ ۳۱۲، الاقناع: ۴/ ۱۵۰، شرح منح الجلیل: ۲/ ۴۴۹۔
(۲) المغنی: ۸/ ۱۷۲۔ (۳) فتح القدیر: ۴/ ۲۲۲-۲۲۳، تاتارخانیہ: ۴/ ۲۵۲۔
(۴) قاضی خاں: ۱/ ۴۴۸، الفتاویٰ الہندیہ: ۱/ ۵۶۵۔ (۵) فتح القدیر: ۴/ ۲۲۰۔
(۶) تاتارخانیہ: ۴/ ۲۵۳۔ (۷) بنی اسرائیل: ۲۶۔

تجدید دین اور مجددین

مولانا محمد اعظم ندوی ☆

تجدید کا مفہوم اور اس کی تعریف

''تجدید'' عربی زبان کا لفظ ہے، یہ تفعیل کے وزن پر مصدر ہے، اس کے معنی ہیں کسی چیز کو جدید کردینا، یا نیا بنادینا (To renew) جدّد فلان الأمر کے معنی ہوتے ہیں: فلاں نے کسی کام یا شئے کو نیا بنادیا، اس اعتبار سے تجدید کا لغوی مفہوم یہ متعین ہوتا ہے کہ کوئی چیز پہلے سے کسی ایک حالت پر موجود تھی، پھر اس پر ایک ایسی حالت طاری ہوئی جس نے اس کی شکل بدل دی اور اس کی زندگی وتازگی ختم کردی، اگر کوئی اس بدلی اور بگڑی ہوئی چیز سے اس کا بگاڑ اور فرسودگی ختم کرکے اس کو پچھلی حالت میں لوٹادے جو اس کی اصلی صورت تھی تو اسی عمل کو تجدید کہا جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں کسی چیز پر بعد کو پیش آنے والے بُرے اثرات کو ختم کرکے اس کو اپنی پہلی صورت پر لے آنا تجدید ہے۔

یہ تو ہے تجدید کا لغوی مفہوم، تجدید کا شرعی مفہوم یا شریعت اسلامی میں اس کی تعریف تلاش کی جائے تو ہمیں الفاظ کے فرق کے ساتھ تین طرح کی تعریفات علماء کی تحریروں میں ملتی ہیں، اور اس سے مراد صرف تجدید کی تعریف نہیں؛ بلکہ تجدید دین کی تعریف ہے۔

(۱) پہلی تعریف: قرآن وسنت کی جو تعلیمات مٹ چکی ہوں ان کو دوبارہ زندہ کرنا، ان کو لوگوں کے درمیان عام کرنا، اور لوگوں کو ان پر عمل کرنے کے لئے آمادہ کرنا، دسویں صدی ہجری کے ایک شافعی فقیہ محمد بن عبدالرحمٰن علقمی نے اس کی تعریف اسی انداز میں کی ہے۔

(۲) دوسری تعریف: بدعات کو مٹانا، اہل بدعت کی پہچان کرانا، ان کی سخت تنقید اور تردید کرنا، اسلام سے جاہلیت کی جو باتیں جوڑ دی گئی ہوں، ان کو الگ کرنا اور دوبارہ اسلام کو اس صورت میں پیش کرنا جس پر وہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں تھا، گیارہویں صدی کے شارح حدیث شیخ محمد عبدالرؤف مُناوی نے اس سے ملتی جلتی تعریف کی ہے، امام سیوطیؒ اور ملا علی قاریؒ کی تعریف بھی اس سے قریب تر ہے۔

☆ استاذ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

(۳) تیسری تعریف : شرعی احکام کو نئے پیش آمدہ مسائل اور واقعات پر منطبق کرنا، اور وحی ربانی کی روشنی میں نئے مسائل کا حل تلاش کرنا، یہ تعریف زیادہ تر معاصر اہل قلم نے کی ہے، جن میں عمر عبید حسنہ، عبدالفتاح ابراہیم اور طیب برغوث وغیرہ کے نام آتے ہیں، جن کی تعریفات کے الفاظ ملتے جلتے ہیں۔

ان تعریفات کی روشنی میں تجدید دین کی ایک جامع شرعی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے :

دین کے مٹے ہوئے نقوش کو اُبھارنا اور ان کو زندہ کرنا، ان کو بدعات اور دین میں پیدا کردہ نئی چیزوں سے محفوظ رکھنا، اور زندگی کے نت نئے پیدا ہونے والے مسائل پر شرعی احکام کو منطبق کرنا۔

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں :

کسی چیز کی تجدید اس وقت ہوتی ہے جب اس کے آثار مٹ جائیں یعنی جب اسلام غریب اور اجنبی ہوجائے تو پھر اس کی تجدید ہوتی ہے۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی لکھتے ہیں :

دین کی تجدید کے معنی اس کی قدیم حالت اور اس کے مزاج و مذاق کو بدلنا، یا اس کی جگہ پر کسی نئے دین کو لانا، یا اس کا نیا ایڈیشن تیار کرنا نہیں؛ بلکہ اس کو اس کی اس قدیم حالت پر لوٹانا ہے، جس پر وہ رسول اللہ ﷺ، صحابہ اور تابعین کے دور میں رہا۔

تجدید دین کی اصطلاح کو پڑھتے ہوئے آپ یہ بھی ذہن نشیں رکھیں کہ تجدید حقیقت میں دین کی نہیں؛ بلکہ تدین یا اُمت کے دین سے کمزور ہوتے ہوئے تعلق کی ہوتی ہے، دین اپنی جگہ مکمل ہے، اس کو تجدید کی ضرورت نہیں، دین کی کوئی مخصوص شکل جسے دین کہا جارہا ہو، اور وہ حقیقت میں دین نہ ہو، اس کو اصل دین کی طرف لوٹانا، تجدیدی عمل کہلاتا ہے، اس عمل کو انجام دینے والا مجدد کہلاتا ہے، جس کی جمع مجددین ہے۔

تجدید اور تجدد میں فرق

تجدید سے قریب تر ایک دوسرا لفظ تجدد ہے، یہ تجدید کا ہم معنی نہیں؛ بلکہ دونوں کے معنی میں فرق ہے، معاصر مذہبی اردو لٹریچر میں تجدد ایک منفی جب کہ تجدید ایک مثبت اصطلاح کے طور پر معروف ہے، تجدید سے مراد کسی شے کو اس کی اصلی حالت پر لوٹانا مثلاً اللہ کے رسول ﷺ اور خلفاء راشدین کے دور میں دین اسلام اپنی حقیقی صورت میں موجود تھا، اس کے بعد رفتہ رفتہ لوگوں کے عقائد میں بگاڑ آنا شروع ہوگیا، اور بدعتی فرقوں مثلاً خوارج، معتزلہ، جہمیہ وغیرہ نے بہت سے باطل نظریات اور تصورات کو دین اسلام کے نام پر پیش کرنا شروع کیا، علماء نے

ان باطل افکارونظریات کی شدومد سے تردید کی، اوردین کے اس حقیقی اور صحیح تصورکوواضح کیا جس پران گمراہ فرقوں کی غلط تشریحات کی وجہ سے حجاب پڑ گیا تھا، اس فعل کا نام تجدید ہے، اس کے برعکس تجدد کے معنی ہیں پہلے سے موجود کسی شئے کا غائب ہوجانا، اوراس کی جگہ نئی چیز کا آجانا، اسلام کے تجدد کا مطلب یہ ہوگا کہ پہلے سے موجود اسلام غائب ہوجائے اوراس کی جگہ نیا اسلام آجائے، اس کواُردو میں تشکیل جدیداورانگریزی میں Reconstruction بھی کہتے ہیں، اسلام کی عمارت گرگئی ہے اوراسے ازسرنوتعمیر کرنا چاہئے، علامہ سید سلیمان ندوی ڈاکٹرمحمداقبال کے تشکیل جدید کےتصور پرتنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> اقبال مرحوم نے خطبات کا نام Recoustruction رکھا، مجھے اس پربھی اعتراض تھا،تعمیرنو یا تشکیل نو کا کیا مطلب؟ کیا عمارت منہدم ہوگئی؟تشکیل نو کا مطلب دین کی ازسرنوتعمیر کے سوا کیا ہے؟ یعنی اسلام کی اصل شکل مسخ ہوگئی، اب اسے ازسرنوتعمیر کیا جائے، یہ دعویٰ پوری اسلامی تاریخ کومسترد کرنے کے سوا کیا ہے؟

مولانا سیدابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں :

> عموماً لوگ تجدد اور تجدید میں فرق نہیں کرتے، ان کا گمان یہ ہے کہ ہروہ شخص جو نیا طریقہ نکالے، اوراس کو ذرا زور سے چلا دے وہ مجدد ہوتا ہے،خصوصاً جولوگ مسلمان قوم کو برسرانحطاط دیکھ کراس کودنیوی حیثیت سے سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں، اوراپنے زمانہ کی برسرعروج جاہلیت سے مصالحت کر کے اسلام اورجاہلیت کا ایک نیامخلوطہ تیارکردیتے ہیں، یا فقط نام باقی رکھ کراس قوم کوپوری جاہلیت کے رنگ میں رنگ دیتے ہیں ان کومجدد کے خطاب سےنوازدیا جاتا ہے، حالاں کہ وہ مجدد نہیں متجدد ہوتے ہیں اوران کا کام تجدید نہیں تجدد ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تجدید ایک مثبت لفظ ہے اوردین میں مطلوب ہے جب کہ تجدد ایک منفی اصطلاح ہے اوردین میں ایک ناپسندیدہ فعل ہے۔

حدیث تجدیداوراس کی تخریج

احادیث نبویہ میں کئی ایسے اشارات ملتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس دین کی حفاظت فرمائے گا، اورقیامت تک اسے باقی رکھے گا، اوریہ کام ان ربانی علماء کے ذریعہ لیتا رہے گا جودین کی نصرت کریں گے، اورسنتوں کوزندہ کریں گے؛ لیکن تجدید کالفظ صرف ایک حدیث میں آیا ہے یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی گئی ہے،متعدد

محدثین نے اس حدیث کو اپنی کتابوں میں الفاظ کے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے، ان میں سے چند کے نام ان کی کتابوں کے ساتھ اس طرح ہیں: ابوداؤد نے سنن ابی داؤد میں، حاکم نے المستدرک میں، بیہقی نے معرفۃ السنن والآثار میں، طبرانی نے المعجم الاوسط میں، خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں، ابوعمرو الوّانی نے الفتن میں، ہروی نے ذم الکلام میں اور ابن عدی نے الکامل میں یہ حدیث ذکر کی ہے، جس کے الفاظ ابوداؤد کے یہاں یہ ہیں :

إن الله يبعث لهذه الأمة على رأس كل مائة سنه من يجدد لها دينها ۔ (۱)

اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر سو سال کے سرے پر ایسے بندے پیدا کرے گا جو اس کے لئے اس کے دین کو نیا اور تازہ کرتے رہیں گے۔

حاکم کی روایت میں ''لهٰذه الامة'' (اُمت کے لئے) کی جگہ ''إلى هذه الامة'' (اُمت کی طرف) ہے اس کو حاکم، سخاوی، سیوطی، مناوی، عراقی، ابن حجر اور بہت سے ماہرین حدیث نے صحیح قرار دیا ہے، البانی نے سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ میں لکھا ہے ''والسند صحیح، ورجالہ ثقات، رجال مسلم'' (اس کی سند صحیح ہے اور اس کو روایت کرنے والے رجال ثقہ ہیں، امام مسلم کے رجال ہیں)، سیوطی مرقاۃ الصعود میں لکھتے ہیں: ''اتفق الحفاظ على تصحيحه'' (حفاظ حدیث اس حدیث کو صحیح قرار دینے پر متفق ہیں)۔

حدیث تجدید کی تشریح

یہ حدیث حضور اکرم ﷺ کی طرف سے امت کے لئے خوشخبری ہے کہ ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے ذریعہ دین اسلام کی حفاظت فرماتے رہیں گے، اور یہ تجدیدی کام ہر صدی میں ہوتا رہے گا، ''بعث'' کے معنی بھیجنے اور اُبھارنے کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ اس اُمت میں ایسے افراد کو انھیں کے درمیان سے اُبھاریں گے اور نمایاں کریں گے جو مخلوق خدا کو فائدہ پہنچائیں گے اور دین کے احکام کو عام کرنے کے لئے کمر بستہ ہو جائیں گے، ''لهٰذه الامة'' کے ذریعہ اشارہ کیا گیا ہے کہ اس سے مراد خود حضور اکرم ﷺ کی یہ آخری اُمت ہے جس کے بعد اب کوئی اُمت نہیں پیدا ہوگی، اور ''دينها'' سے مراد اس اُمت کا آخری دین و مذہب یعنی اسلام ہے جس پر وہ ایمان رکھتی ہے یا اس کا وہ طریقہ ہے جس کو وہ دین کے طور پر اپناتی ہے، جب کہ وہ دین نہیں ہوتا؛ بلکہ دین کی بگڑی ہوئی شکل ہوتی ہے، مجدد اس کو اس کے اصل دین کی طرف واپس لانے کی کوشش کرتا ہے، ''لهٰذه الامة'' میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو بھی مجدد ہوگا وہ صرف اپنے لئے نہیں؛ بلکہ پوری اُمت کے لئے جیئے گا، اس کی ترقی پر خوش اور اس کے انحطاط پر بے چین ہو جائے گا، اور وہ اُمت کا کھویا ہوا وقار اور اسلام پر اس کا اعتماد بحال کرے گا۔

(۱) سنن ابوداؤد: کتاب الملاحم، باب ما یذکر فی قرن المائۃ، حدیث نمبر: ۴۲۹۱۔

اس حدیث میں ایک لفظ ''رأس'' کا بھی استعمال ہوا، رأس کے معنی لغت میں ابتداء اور انتہاء دونوں کے ہوتے ہیں، اس حدیث میں ''رأس'' کے کیا معنی ہیں؟ اس سلسلہ میں علماء کے دونوں نقطۂ نظر موجود ہیں، بعض علماء اس سے ابتداء مراد لیتے ہیں، اور بعض علماء اس سے انتہاء مراد لیتے ہیں، ملاعلی قاری فرماتے ہیں: ''یعنی ہر سو سال کی ابتداء یا انتہاء میں جب بھی علم وسنت کا تناسب گھٹ جائے اور جہالت وبدعت بڑھ جائے''، ابن الاثیر، طیبی اور متعدد علماء نے سو سال کی انتہا کے قول کو زیادہ راجح قرار دیا ہے، شمس الحق عظیم آبادی نے ابوداؤد کی شرح عون المعبود میں اس قول کی تائید میں یہ دلیل بھی پیش کی ہے کہ بہت سے علماء نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو پہلی صدی کا مجدد قرار دیا ہے، ان کا سن وفات ۱۰۱ھ ہے، اور دوسری صدی کا مجدد امام شافعی کو قرار دیا ہے، جن کا سن وفات ۲۰۴ھ ہے، ان دونوں نے اس صدی کا آخری حصہ تو پایا جس کا ان کو مجدد تسلیم کیا گیا ہے، کا آخری حصہ تو پایا؛ لیکن ان صدیوں کے آغاز میں موجود نہ تھے؛ چوں کہ عمر بن عبدالعزیز ۶۱ھ میں پیدا ہوئے، اور امام شافعی کی پیدائش ۱۵۰ھ کی ہے؛ لیکن مناوی نے اس نقطۂ نظر پر تنقید کی ہے کہ اگر وفات کو معیار بنایا جائے تو مقصد حاصل نہیں ہو رہا ہے؛ اس لئے کہ صدی کے ختم ہونے کے بعد مجدد کار تجدید کے لئے کھڑا نہیں ہو رہا ہے؛ بلکہ اس وقت تو اس کا انتقال ہو رہا ہے، تجدیدی کام تو اس نے پہلے کر لیا، صدی کے اخیر میں یا نئی صدی کے شروع میں اس کی پیدائش نہیں وفات ہو رہی ہے۔

بعض لوگوں نے اس معنی پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وفات کو ہی بنیاد بنا کر اس کی تشریح کی جائے؛ لیکن کوئی ایسی شخصیت جس کے تجدیدی کارنامے موجود ہوں اور صدی کے مکمل ہونے سے چند دن پہلے اس کا انتقال ہو جائے، تو کیا اس کو مجدد میں شمار نہیں کیا جائے گا؟ اس لئے بہت سے علماء نے اس حدیث کی تشریح میں یہ وضاحت کی ہے کہ اس سے مراد ہر سو سال ہے، رأس کی قید اتفاقی ہے، مجدد اپنی وفات کے اعتبار سے صدی کے شروع کا حصہ بھی پا سکتا ہے، درمیان کا بھی اور اخیر کا بھی، سیوطی کہتے ہیں کہ کبھی کبھی صدی کے درمیان میں ایسی شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں جن کو مجدد قرار دینا دوسری ایسی کسی شخصیت کے مقابلہ میں زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے جس نے صدی کا آخری حصہ پایا ہو، مولانا منظور نعمانی کے مطابق ''کل مائة سنة'' (ہر سو سال) سے صدی ہجری کا متعین نظام مراد نہیں ہو سکتا چوں کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں ہجری کیلنڈر موجود ہی نہیں تھا، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں شروع ہوا، ولادت نبوی، یا بعثت نبوی یا وفات نبوی کے حساب سے بھی صدی کا نظام متعین کرنے کا کوئی قرینہ اس حدیث میں نہیں ہے؛ اس لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ حدیث کے لفظ ''کل مائة سنة'' کا مطلب بس ''کل قرن'' (ہر صدی) سمجھا جائے اور ظاہر ہے کہ جب اس لفظ سے صدی کا کوئی متعین نظام مراد نہیں رہا تو پھر ''رأس'' کے لفظ کو زائد ماننا پڑے گا اور حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر قرن یعنی ہر صدی اور ہر دور میں اس اُمت میں ایسے افراد پیدا فرمائیں گے جو کار تجدید انجام دیں گے، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں :

> ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوئے جنھوں نے تحریفات وتاویلات کا پردہ چاک کردیا اورحقیقت اسلام اور''دین خالص'' کواجاگر کیا، بدعات اورعجمی اثرات کے خلاف آواز بلند کی، سنت کی پرزورحمایت کی، عقائد باطلہ کی بے باکانہ تردیداورمشرکانہ اعمال ورسوم کے خلاف علانیہ جہاد کیا، مادیت اورنفس پرستی پر کاری ضرب لگائی، تعیّشات اوراپنے زمانہ کے''مترَفین''(متکبردولت مندوں کوقرآن مجید مترفین کے لفظ سے یاد کرتا ہے) کی سخت مذمت کی، اورجابرسلاطین کے سامنے کلمۂ حق بلند کیا، عقلیت پرستی کاطلسم توڑااوراسلام میں نئی قوت وحرکت اورمسلمانوں میں نیاایمان اورنئی زندگی پیدا کردی، یہ افراد دماغی، علمی، اخلاقی اورروحانی اعتبار سے اپنے زمانہ کے ممتازترین افراد تھے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کواس دین کی حفاظت اور بقاء منظور ہے، اوردنیا کی رہنمائی کا کام اسی دین اوراسی اُمت سے لینا ہے، اورجوکام وہ پہلے تازہ نبوت اورانبیاء سے لیتا تھا، اب رسول اللہ ﷺ کے نائبین اوراُمت کے مجددین ومصلحین سے لے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جوبھی تجدید دین اوراحیاءِ دین کا کام انجام دے گا، اورجس دور میں بھی انجام دے گااس حدیث میں جس تجدید دین کا ذکر ہے وہ اس میں شامل ہوگا، خواہ اسے مجددین میں شمار کیا گیا ہو یہ نہ کیا گیا ہو، مجدد کا منصب کوئی ایسا ٹائٹل نہیں جس کواختیار کرنے کی کوشش کی جائے نہ یہ شرعاً مطلوب ہے، شرعاً مطلوب یہ ہے کہ ہرشخص اپنی استطاعت کے مطابق دین کی نشرواشاعت اوراس میں داخل ہونے والی غلط باتوں کی اصلاح کرتا رہے، مجدد کا مقام اسے حاصل ہوا یا نہیں یہ بعد کے لوگ اس کے کاموں کودیکھ کر طے کریں گے یا اللہ کوبہتر معلوم ہے کہ وہ اس لقب کا مستحق تھا یانہیں، اصل مطلوب کارتجدید ہے نہ کہ مجدد بننا یا مجدد قرار دینا۔

ایک دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ صدی کی انتہا کا لحاظ کیا جائے توعمر بن عبدالعزیز (۱۰۱ھ) شافعی (۲۰۴ھ) ابن سریج (۳۰۶ھ) باقلانی (۴۰۳ھ) غزالی (۵۰۵ھ) رازی (۶۰۶ھ) ابن دقیق العید (۷۰۳ھ) وغیرہ تومجددین میں آجائیں گے؛ چوں کہ وہ ایک صدی موجود تھے اورنئی صدی کے آغاز پران کی وفات ہوئی اوران کوعلماء نے مجددین میں شمار بھی کیا ہے؛ لیکن امام ابوحنیفہؒ (۱۵۰ھ) امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ)، ابن جوزی (۵۹۷ھ) ابن تیمیہ (۷۳۸ھ) ابن قیم (۷۵۱ھ) شاطبی (۷۹۰ھ) ابن حجر (۸۵۲ھ) اورشاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۷۶ھ) یا ان جیسے سینکڑوں علماء مجددین میں شمار نہیں ہوں گے جنھوں نے یقیناً دین کی خدمت کے لئے اپنی

زندگی وقف کردی تھی اور ایسا صرف اس وجہ سے ہوگا کہ صدی کی انتہاء پر یا صدی کے فوراً بعد ان کی وفات نہیں ہوئی، نواب صدیق حسن خان نے ''حجج الکرامۃ'' میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے بعض اہل علم سے نقل کیا کہ یہ ''رأس مائۃ'' سے مراد خاص صدی کا آغاز نہیں؛ بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ تعالی ہر صدی میں مجدد کھڑا کرے گا خواہ شروع میں ہو خواہ درمیان میں، خواہ آخر میں، اور رأس کی قید محض اتفاقی ہے، اور غرض حدیث کی صرف یہ ہے کہ کوئی صدی کسی مجدد کے وجود سے خالی نہ رہے گی اور ہر صدی کے شروع، درمیان اور آخر میں مجددین کا ہونا اس احتمال کے صحیح ہونے کی تائید کرتا ہے۔

اس حدیث کا ایک ٹکڑا ہے''من یجدد لها دینها''میں ''مَن'' کے لفظ سے ایک شخص مراد ہے یا کئی اشخاص یا پوری جماعت، بہت سے علماء نے یہ رائے اختیار کی ہے کہ مجدد فرد واحد ہی ہوگا، سیوطی نے اشعار کی شکل میں مجددین اور ان کے کارتجدید پر ''أرجوزة تحفة المهتدين بأخبار المجددين'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے، اس میں اس قول کو حدیث کے مطابق اور جمہور علماء کا قول قرار دیا ہے کہ ہر دور میں مجدد ایک ہی شخص ہوگا، متعدد اشخاص نہیں ہوں گے جن علماء نے یہ رائے اختیار کی ہے انھوں نے ہر صدی کے ایک مجدد کی تعیین بھی کی ہے، اور بعض صدیوں میں مجدد کی تعیین میں ایک سے زیادہ نام ذکر کئے ہیں، جب کہ دیگر بہت سے علماء ''مَن'' کو عموم کے لئے مانتے ہیں؛ چوں کہ یہ لفظ ایک شخص اور پوری جماعت دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، ان علماء میں ابن حجر، ابن الاثیر، ذہبی، ابن کثیر اور ملا علی قاری کے نام مشہور ہیں، ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ :

> ''من یجدد'' سے مراد ایک شخص نہیں ہے بلکہ جماعت مراد ہے، اس جماعت کا ہر فرد کسی علاقہ میں شرعی علوم میں سے کسی ایک فن یا کئی فنون میں اپنی استطاعت کے مطابق تقریر وتحریر کے ذریعہ تجدیدی عمل انجام دے گا، جو اس فن کے باقی رہنے اور قیامت تک نہ مٹنے کا سبب بنے گا۔

مولانا سید ابوالاعلی مودودی اس کی مزید وضاحت اس طرح کرتے ہیں :

> ''مَن'' کا لفظ عربی زبان میں واحد اور جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس لئے ''مَن'' سے مراد ایک شخص بھی ہوسکتا ہے، بہت سے اشخاص بھی ہو سکتے ہیں اور پورے پورے ادارے اور گروہ بھی ہو سکتے ہیں، حضور ﷺ نے جو خبر دی ہے کہ اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ ان شاء اللہ اسلامی تاریخ کی کوئی صدی ایسے لوگوں سے خالی نہ گذرے گی جو طوفان جاہلیت کے مقابلہ میں اٹھیں گے اور اسلام کو اس کی اصل روح اور صورت میں از سر نو قائم کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے، ضروری نہیں کہ

> ایک صدی کا مجدد ایک ہی شخص ہو، ایک صدی میں متعدد اشخاص اور گروہ یہ خدمت انجام دے سکتے ہیں، یہ بھی ضروری نہیں کہ تمام دنیائے اسلام کے لئے ایک ہی مجدد ہو، ایک وقت میں بہت سے ملکوں میں بہت سے آدمی تجدید دین کے لئے سعی کرنے والے ہو سکتے ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں :

> ...... دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہے اور اس وقت تک کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ وہ اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا رہے گا جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے اور مجموعاً یا انفراداً اس دین کو تازہ اور اس اُمت کو سرگرم عمل رکھیں گے۔

یہ قول کہ مجدد ایک نہیں؛ بلکہ متعدد ہوتا ہے اس لئے بھی زیادہ مناسب ہے کہ بقول حافظ ابن حجر تجدید کے لئے جو لازمی صفات ہیں ضروری نہیں کہ ایک شخص کے اندر پورے طور پر جمع ہو جائیں، ہاں یہ دعویٰ عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں کیا جا سکتا ہے کہ پہلی صدی میں وہ ایسی شخصیت کے مالک ہیں جو خیر کی تمام صفات کے جامع اور اس میں پیش پیش ہیں، اسی لئے امام احمد نے مطلق فرمایا کہ حدیث کی رو سے علماء نے پہلی صدی کا مجدد انھیں کو قرار دیا ہے، جہاں تک ان کے بعد والوں کا تعلق ہے مثلاً امام شافعی اگر چہ اوصاف حمیدہ سے متصف ہیں؛ لیکن جہاد اور عدل کے مطابق فیصلہ کرنے کا موقع ان کو ہاتھ نہیں آیا؛ اس لئے جو شخص بھی سو سال کے سرے پر خیر کی صفات میں سے کسی صفت سے بھی متصف ہو وہ اس حدیث کی مراد ہوگا، خواہ وہ ایک ہو یا ایک سے زیادہ۔

تجدید دین کا دائرۂ کار یا مجدد کے فرائض

اجمالی طور پر اگر تجدید دین کے فرائض کا ذکر کیا جائے تو وہ درج ذیل ہو سکتے ہیں :

(۱) کتاب وسنت کے اصل نصوص کی حفاظت، ان کے ضائع ہونے اور ان میں تحریف وتبدیلی سے ان کا تحفظ، گو کہ قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے اور اس میں حدیث کی حفاظت بھی شامل ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ذریعہ علماء اسلام کو ہی بنایا؛ چنانچہ اس سلسلہ میں جو کوشش بھی کی جائے گی وہ تجدیدی کام کا ایک حصہ قرار پائے گا۔

(۲) نصوص کے صحیح معانی کو اُمت تک منتقل کرنا اور ان کے صحیح فہم کو زندہ کرنا۔

(۳) نئے پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کرنا، اور ان کا صحیح اسلامی حل پیش کرنا۔

(۴) اُمت میں عام اصلاحی کوشش کرنا یعنی جاہلی رسوم کو مٹانا، بدعات کو ختم کرنا، اخلاق کا تزکیہ کرنا، شریعت پر عمل اور اتباع سنت کا رجحان پیدا کرنا۔

(۵) دین کا دفاع اور اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں :

> یعنی رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ میری اُمت کبھی گمراہی پر متفق نہ ہوگی اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد کہ اللہ تعالیٰ اس اُمت کے لئے ہر صدی کے سرے پر ایسے بندے پیدا کرتا رہے گا جو اس کے لئے اس کے دین کو تازہ کرتے اور نکھارتے رہیں گے، آپ کے ان ارشادات کی وضاحت اور تشریح آپ کی اس حدیث سے ہوتی ہے جو حدیث کی کتابوں میں آئی ہے کہ میرے لائے ہوئے اس علم یعنی دین کی امانت کو ہر زمانہ کے اچھے اور نیک بندے سنبھالیں گے اور اس کی خدمت وحفاظت کا حق ادا کریں گے، وہ غلو اور افراط دونوں کی تحریفوں سے اور باطل پرست لوگوں کے قرآن وحدیث کے غلط مفہوم بیان کرنے سے اور جاہلوں کی فاسد تاویلوں سے اس دین کی حفاظت کریں گے۔

حقیقت یہ ہے تجدید دین کا دائرہ بہت وسیع ہے، جس شخص نے بھی اسلام کو ایک زندہ جاوید دین کے طور پر پیش کرنے کی انتھک کوشش کی اور اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ اس دین کے اُصولوں اور تعلیمات کی حفاظت اور ان کی نشر واشاعت میں گذارا، اور دین میں داخل ہونے والی نئی نئی چیزوں کی اپنی خاص صلاحیتوں اور اپنے مخصوص طرز واُسلوب میں نشاندہی کی اور ان سے دین کے لیبل کو ختم کر کے ان کو جاہلیت قرار دیا اور صحیح اسلامی تصور پیش کیا اس کا اس کار تجدید میں حصہ ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے صحیح لکھا ہے کہ :

> اس میراث میں ہر اس فرد کا پورا حصہ ہے، جس نے اسلام کے کسی دور میں بھی منہاج نبوت پر حکومت قائم کی، جاہلیت اور مادیت کا مقابلہ کیا، اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی، اسلام کے جو خصائص مٹ گئے تھے ان کو اُجاگر کیا، اُمت میں ایمانی روح پیدا کی، اور جس نے اس دین پر اس کے مآخذ اور اس کی تعبیرات پر اعتماد کو ازسرنو استوار کیا، اسلام کی حقیقی فکر کی حفاظت کی، اور اس اُمت کو کسی نئے فتنہ میں پڑنے سے باز رکھا، جس نے اس امت کے لئے اس کے دین اور مصادر دین کی حفاظت کی، حدیث وفقہ کی تدوین جدید کا کام انجام دیا، اجتہاد کا دروازہ کھولا، اور اُمت کو زندگی ومعاشرہ

کا منظم قانون عطا کیا ،جس نے معاشرہ میں احتساب کا فرض ادا کیا اوراس کے انحراف اور کج روی پرکھل کرتنقید کی ،اور صحیح اور حقیقی اسلام کی برملا وآشکار دعوت دی ، جس نے شکوک وشبہات کے دوراوراضطراب عقائد کے زمانہ میں علمی طرز استدلال اختیار کر کے دماغوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ،اورایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی ، جس نے دعوت وتذکیراورانذار وتبشیر میں انبیاء علیہم السلام کی نیابت کی ،اورایمان کی دبی ہوئی چنگاریوں کو شعلہ جوالہ کی حرارت وحرکت بخشی ، یہ ایک پورا سلسلہ ہے اوراس میں ہراس شخصیت کاایک خاص حصہ اورمرتبہ ہے۔

مولانا محمد منظور نعمانی اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

اس کارتجدید میں ہر دور کے ان سب بندگان خدا کا حصہ ہے،جن سے اللہ تعالیٰ نے دین کی کسی قسم کی خدمات لیں،اس طرح اُمت میں مجددین کی تعداد صرف تیرہ چودہ ہی نہ ہوگی (جن کی تعیین میں اختلافات ہوں ، اور ہر حلقہ اپنے ہی کسی بزرگ کے مجدد ہونے پر اصراراوردوسروں سے تکرار کرے) بلکہ اللہ کے ہزاروں وہ بندے جن سے اللہ تعالیٰ نے دین کی ایسی خدمتیں مختلف زمانوں اورمختلف ملکوں میں لی ہیں سب ہی اس کارتجدید میں حصہ دار ہوں گے،اورسب ہی مجددین میں ہوں گے۔

ان دواقتباسات سے آپ کے لئے سمجھنا آسان ہوگیا کہ تجدید دین کا دائرہ کس قدر وسیع ہے،اوردین کی کوئی مخصوص خدمت ہی تجدید نہیں ؛ بلکہ اس کے مختلف شعبوں میں جس کا جس قدر بھی حصہ ہے وہ اس تجدیدی عمل میں حصہ دار ہے،اوراس نے اپنے گردوپیش کے تقاضوں کے مطابق کام کیا ہے،اس میں علمی اور عملی دونوں قسم کی تجدید شامل ہے۔

مجدد کے اوصاف

ایک مجدد یا کارتجدید انجام دینے والی شخصیت کے بنیادی اوصاف کیا ہوں ، اس سلسلہ میں ہمیں قرآن وحدیث سے واضح رہنمائی نہیں ملتی ؛لیکن کچھ تو تجدید دین کی تعریف اورحدیث تجدید''من یجدد لھا دینھا'' کی تشریح سے آپ نے ان اوصاف کا اندازہ لگایا ہوگا اور کچھ ان علماء کی سیرت پرغور کرنے سے یہ صفات نمایاں ہوتی ہیں جن کو تاریخ کے مختلف ادوار میں مجددین کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے،منادی، علقمی ،ابن الاثیراورسیوطی وغیرہ نے علاحدہ علاحدہ چند اوصاف کا ذکر کیا ہے جن کو ہم یکجا اس طرح بیان کرسکتے ہیں کہ :

مجدد وہ ہے جو دینی علوم کا ماہر ہو، دینی علوم میں فقہ باطن یا تزکیہ واحسان بھی شامل ہے،

علم اور اہل علم کا معاون ہو، بدعت اور اہل بدعت سے دور اور ان کی اصلاح کے لئے کوشاں ہو، اس کے اندر اظہار حق کی صلاحیت اور باطل کو پہچان کر اس کی تردید کرنے کا ملکہ ہو، حاضر دماغ اور زندہ دل ہو، دینی اُمور میں اس کا نفع عام اور مشہور ومعروف ہو، شریعت کے مصادر احکام اور زمانہ کی ضرورتوں پر اس کی نظر ہو، اور وہ باریک بینی کے ساتھ اپنے دور کے مختلف مسائل کا حل دریافت کرنے کے سلسلہ میں سنجیدہ ہو۔

مشہور مجددین اسلام

مجدد کون ہے؟ جیسا کہ ابھی بیان ہوا کہ اس سلسلہ میں علماء کے دو نقاط نظر ہیں، ایک یہ کہ مجددین کی فہرست میں وہی شخصیت شامل ہوگی جو کسی صدی ہجری کے اختتام پر زندہ، مشہور اور مرجع خلائق ہو، اس کے علم سے لوگوں کو فائدہ پہنچ رہا ہو، دوسرے یہ کہ صدی کے آخری سرے کی بات اتفاقی طور پر آئی ہے اصل میں اس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں، جنھوں نے صدی کی ابتداء، وسط یا انتہاء پر تجدید دین کے سلسلہ میں کوئی بڑا قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے، آپ نے یہ بھی پڑھا کہ زیادہ تر علماء کا رجحان اسی طرف ہے، جو حضرات صدی کے اختتام پر کسی شخصیت کے زندہ رہنے اور نئی صدی کے آغاز یا ابتدائی چند سالوں میں کسی شخصیت کی وفات کا سال دیکھ کر اس کے کارناموں کو دیکھتے ہوئے مجدد ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں، انھوں نے اسلام کی چودہ صدیوں میں سے ہر صدی کے ایک مجدد یا متعدد مجددین کے طور پر کچھ علماء کے نام ذکر کئے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ابن شہاب زہری (م: ۱۲۴ھ) نے سب سے پہلے پہلی صدی کا مجدد عمر بن عبدالعزیز کو قرار دیا، اس کے بعد امام احمد بن حنبلؒ (م: ۲۴۱ھ) نے بھی اس کی تائید کی اور چوں کہ امام احمد دوسری صدی کا اختتام بھی دیکھ چکے تھے؛ اس لئے دوسری صدی ہجری کے مجدد کی حیثیت سے انھوں نے امام شافعی (م: ۲۰۴ھ) کا نام ذکر کیا، دراصل امام احمد ایک روایت پیش کرتے ہیں، جس میں یہ بھی تذکرہ ہے کہ کار تجدید انجام دینے والا شخص رسول اللہ ﷺ کے گھرانے سے ہوگا، اس لئے انھوں نے آل رسول میں سے اس مرتبہ کی شخصیت پہلی صدی میں عمر بن عبدالعزیز کو پایا اور دوسری صدی میں امام شافعی کو، ابن عساکر دمشقی (م: ۵۷۱ھ) اپنی کتاب ''تبيين كذب المفتري فيما نسب إلى الأشعري'' میں لکھتے ہیں: ''میں نے شیخ ابوالحسن علی بن مسلم سلمی سے جامع دمشق میں سنا کہ پہلی صدی کے مجدد عمر بن عبدالعزیز ہیں، دوسری صدی کے مجدد امام شافعی، تیسری صدی کے مجدد ابوالحسن اشعری، چوتھی صدی کے مجدد ابن الباقلانی اور پانچویں صدی کے مجدد امیر المؤمنین مسترشد باللہ ہیں، پھر لکھتے ہیں: کہ میرے نزدیک پانچویں صدی کے مجدد امام ابو حامد محمد غزالی ہیں، آگے لکھتے ہیں کہ بعض دوسرے لوگوں نے تیسری صدی کا مجدد ابوالعباس ابن سریج کو اور چوتھی صدی کا مجدد سہل بن محمد صعلوکی نیساپوری کو قرار دیا ہے، لیکن میرے نزدیک تیسری صدی کے مجدد تو اشعری ہی ہیں، اور پھر اس کے

اسباب ذکر کئے ہیں، ابن عساکر کے بعد ابن الاثیر (م:۲۰۶) کے نزدیک ہمیں یہ درجہ بندی ملتی ہے، انھوں نے اپنی کتاب ''جامع الأصول'' میں یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ ہرصدی سے انہوں نے ایک خلیفہ، ایک محدث، مختلف فقہی مذاہب کے نمائندوں میں سے ایک ایک فقیہ، ایک قاری، ایک صوفی اور ایک متکلم اسلام کا مجدد کی حیثیت سے انتخاب کیا ہے؛ چنانچہ انھوں نے پہلی صدی ہجری کے لئے جب کہ فقہ وتصوف اور علم کلام کو مستقل فن کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی اوران کی تدوین وترتیب عمل میں نہیں آئی تھی چودہ مجددین شمار کرائے ہیں، جن میں عمر بن عبدالعزیز کے علاوہ مدینہ، مکہ، یمن، شام اورکوفہ وبصرہ کے مشہور فقہاء مثلاً قاسم بن محمد، مجاہد، عکرمہ، عطاء، طاؤس، مکحول، حسن بصری اورابن سیرین کا ذکر کیا ہے، محدثین میں ابن شہاب زہری کا ذکر کرتے ہوئے مشہور تابعین وتبع تابعین کی ایک جماعت کواس میں شامل مانا ہے، قراء میں عبداللہ ابن کثیر کا ذکر کیا ہے، دوسری صدی کے مجددین میں مامون رشید، امام شافعی، حنفی فقیہ حسن بن زیادلؤلوی، مالکی فقیہ اشہب بن عبدالعزیز شیعی امام فقیہ علی بن موسیٰ رضا، مشہور قاری یعقوب حضرمی، مشہور محدث یحییٰ بن معین اورمشہور صوفی معروف کرخی کوشمار کیا ہے، اسی ترتیب سے تیسری، چوتھی اور پانچویں صدی کی شخصیات کا بھی ذکر کیا ہے، تیسری صدی میں جن لوگوں کا ذکر کیا ہے ان میں مقتدر باللہ، ابوجعفر طحاوی، ابوالحسن اشعری اورامام نسائی کے نام مشہور ہیں، چوتھی صدی میں حاکم نیساپوری، ابوحامد اسفرائینی، ابوبکر خوارزمی اورابن فورک وغیرہ ان کے ذکر کردہ ناموں میں مشہور ہیں، پانچویں صدی میں امام غزالی کے علاوہ قاضی مروزی حنفی، زاغونی حنبلی اورمحدثین میں رزین بن معاویہ اوردیگر نام ذکر کئے ہیں، اخیر میں لکھتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے اپنے زمانہ میں مشہور تھے، ہرصدی میں ان سے پہلے بھی بڑے لوگ پیدا ہوئے؛ لیکن ان کوصدی کی آخری گھڑی نہیں ملی۔

آپ نے دیکھا کہ ابن الاثیر نے توسع اختیار کیا ہے اور ہرصدی میں ایک کے بجائے کئی نام ذکر کئے ہیں، اورانھوں نے اس کی وجہ یہی لکھی ہے کہ ہرمصنف صرف اپنے مسلک ومشرب کی شخصیات کومجددین میں شمار کرتا ہے؛ اس لئے ہم نے ہرفن کے علماء، قراء، صوفیاء، مختلف مذاہب فقہ کے فقہاء اور حکام وقت کوبھی اس میں شامل کیا ہے، اورنہ صرف اہلسنت والجماعت کی شخصیات کا ذکر کیا ہے؛ بلکہ شیعہ علماء کوبھی اس زمرہ میں رکھا ہے؛ لیکن اس کی بنیاد وہی صدی کے اختتام کو پانے اوردوسری صدی کے آغاز میں وفات ہونے پر ہے، آپ پڑھ چکے ہیں کہ سیوطی (م:۹۱۱ھ) نے اس سلسلہ میں ایک منظوم رسالہ ''تحفة المهتدين بأخبار المجددين'' کے نام سے تحریر کیا ہے، مجددین کی تعیین کے سلسلہ میں ان کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے، انھوں نے ابن عساکر اورابن اثیر وغیرہ کے ذکر کردہ پانچویں صدی تک کے مجددین کے نام باقی رکھتے ہوئے چھٹی صدی کے لئے فخرالدین رازی یا رافعی، ساتویں کے لئے ابن دقیق العید اورآٹھویں کے لئے بلقینی یا حافظ زین الدین عراقی کے نام مجددین کی حیثیت سے پیش کئے ہیں، اوراللہ کے فضل سے اُمید ظاہر کی ہے کہ نویں صدی کے مجدد وہ یعنی امام سیوطی خود ہیں، اگرآپ تاریخ

تجدید پرلکھی گئی بعض دیگر تحریروں کا مطالعہ کریں تو آپ کو اور بھی کچھ نام مل جائیں گے مثلاً: پہلی صدی میں محمد الباقر، دوسری صدی میں احمد بن حنبل، تیسری صدی میں طبری اور شیعہ عالم دین محمد بن یعقوب الکلینی، چوتھی صدی میں ابوبکر باقلانی، حافظ عبدالغنی، اور طبری، پانچویں صدی میں ابونعیم اصفہانی اور ابن حزم، چھٹی صدی میں عمر نسفی، ساتویں صدی میں ابن تیمیہ، عزالدین بن عبدالسلام، شہاب الدین سہروردی، ابن الاثیر، اور خواجہ معین الدین چشتی، آٹھویں صدی میں شاطبی، تفتازانی اور نظام الدین اولیاء، نویں صدی میں ابن حجر اور سیوطی، دسویں صدی میں شمس الدین الرملی اور محمد طاہر پٹنی، گیارہویں صدی میں مجدد الف ثانی، ابراہیم بن حسن کردی اور عبداللہ بن علوی حدّاد، بارہویں صدی ہجری میں محمد بن عبدالوہاب، شاہ ولی اللہ دہلوی، مرتضیٰ زبیدی، شاہ عبدالعزیز اور عثمان دان فودیو، تیرہویں صدی ہجری میں محمد عبدہ، محمد رشید رضا، طاہر بن عاشور، شوکانی، بدیع الزماں نورسی، زاہد الکوثری، سید احمد شہید بریلوی، شاہ اسماعیل شہید، سید نذیر حسین دہلوی، قاضی حسن انصاری خزرجی، محمد قاسم نانوتوی اور نواب صدیق حسن خاں، چودہویں صدی میں محمد متولی شعراوی، اشرف علی تھانوی، حسن البناء، احمد رضا خان، ناصر الدین البانی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، اور سید ابوالحسن علی ندوی، اور ان کے علاوہ دیگر بہت سے نام مل جائیں گے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تمام علماء سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اپنے وقت میں بڑی نمایاں خدمات لی ہیں؛ لیکن اس فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر مکتب فکر نے ایسی شخصیت کو مجدد کے طور پر پیش کیا ہے، جس سے اس کا تعلق ہے، اور حد تو یہ ہے کہ سیوطی نے خود اپنے لئے اس منصب کا دعویٰ کیا ہے جس کو کچھ لوگوں نے مانا اور اکثر لوگوں نے رد کر دیا تھا۔

اس کے برخلاف جو لوگ اس کو صدی کے اختتام اور نئی صدی کے آغاز میں وفات ہونے سے نہیں جوڑتے انھوں نے اس کا دائرہ وسیع رکھا ہے؛ چنانچہ بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری میں کرمانی کا قول نقل کیا ہے کہ اس سلسلہ میں یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جاسکتی، اگر مجدد کو نامزد کرنے کی اجازت دے دی جائے تو حنفی اپنے فلاں فلاں علماء کو، حنابلہ اور مالکیہ اپنے فلاں فلاں علماء کو، صوفیاء اپنے شیوخ کو، محدثین اپنے اساتذہ کو اور سیاسی اُمور سے دلچسپی رکھنے والے لوگ حکام کو اس فہرست میں شامل کرنا شروع کردیں گے، جب کہ دین کی تصحیح وتجدید کا کام ہمہ گیر ہے اور اس کا تعلق ان تمام میدانوں سے ہے، دوسرے یہ کہ صدی کے اختتام اور دوسری صدی کا آغاز بہت سی شخصیات کے حصہ میں نہیں آتا؛ لیکن صدی کے شروع یا درمیان میں انھوں نے بڑے بڑے کام کئے ہوتے ہیں وہ سب اس فہرست میں شامل ہوں گے، عجیب اتفاق ہے کہ ابتدائی دس صدیوں میں مجددین کی فہرست زیادہ تر شافعی علماء نے پیش کی اور ان میں زیادہ تر ان علماء کا ذکر کیا جو خود شافعی تھے، اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام بخاری، امام مسلم اور ان جیسے جلیل القدر علماء مجددین کی فہرست میں شامل نہیں اور ان کے بہت سے شاگرد اور فیض یافتہ حضرات کو مجدد قرار دیا گیا ہے، جب کہ وہ ان کے درجہ کو نہیں پہنچتے؛ اس لئے صحیح

بات یہ ہے کہ دین کی تجدید کا کام کسی ایک خاص شخص سے متعلق نہیں جو کرشماتی انداز میں سامنے آئے یا اُمت کو اس کا حکم نہیں دیا گیا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے مجدد کو تلاش کرے اور جب اس کو پالے تو یہ سمجھے حقیقی فلاح وسعادت بس اسی کی اتباع سے نصیب ہوگی؛ بلکہ اللہ تعالیٰ تجدید کا کام صرف ایک فرد سے نہیں مختلف افراد سے اور مختلف جماعتوں سے لیں گے، آخری دور میں دین کی نصرت کا کام حضور اکرم ﷺ نے ایک جماعت سے مربوط کیا ہے، فرمایا :

میری اُمت کی ایک جماعت اللہ کے حکم پر قائم رہے گی، ان کی مخالفت کرنے والے اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا پائیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے گی اور وہ اسی پر قائم رہیں گے۔

یہ بات قرآن مجید کی اس آیت کے بھی مطابق ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اور ہماری مخلوق میں ایک جماعت ایسی بھی ہے (جس کے افراد) حق کے موافق ہدایت کرتے ہیں اور اسی کے موافق انصاف بھی کرتے ہیں۔ (الاعراف:۱۸۱)

رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کو تلاوت کر کے ارشاد فرمایا کہ یہ اُمت جس کا ذکر اس آیت میں ہے میری اُمت ہے؛ اس لئے اُمت کو نہ کسی مجدد کے انتظار کا حکم ہے اور نہ اُمت میں کسی کے لئے یہ درست ہے کہ وہ اپنے لئے مجدد ہونے کا دعویٰ کرے، اور نہ کسی اور کے لئے یہ درست ہے کہ وہ حتمی طور پر کسی ایک شخصیت کو ہی مجدد قرار دے؛ بلکہ اُمت کے ہر فرد کو حکم ہے کہ وہ عام اصلاح کا کام کرتا رہے، یہ اللہ پر چھوڑ دے کہ مجدد کون ہے؟ ہاں کسی کی خدمات کو دیکھ کر اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ مجدد دین میں ایک ہو اور وہ بھی اس لئے کہ اس کے اصلاحی کارناموں سے روشنی حاصل کرتے ہوئے اصلاح وتجدید کے کام کو آگے بڑھایا جائے، اس کی خدمات کا صحیح تعین کرتے ہوئے دوسرے مجددین ومصلحین کا بھی اعتراف کیا جائے اور تجدید دین میں ان سب کا حصہ ان کے دائرہ اور مرتبہ کے مطابق تسلیم کیا جائے یہی حق وانصاف کی بات ہے اور اسی طرز فکر سے ہم اسلام کو دین حق اور صراط مستقیم کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔

• • •

کتابیات

(۱) تذکرہ مجدد الف ثانی : مولانا منظور نعمانی۔
(۲) مقدمہ تاریخ دعوت وعزیمت (جلد اول) : مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ۔
(۳) تجدید واحیاء دین : مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔
(۴) تجدید دین : مولانا وحید الدین خان۔

غیر مسلم والدین اور اسلامی تعلیمات

مولانا محمد بن عبداللہ ندوی ☆

اللہ تبارک وتعالیٰ حکیم ودانا ہے، وہ انسان کی فطرت کو سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ والدین اور اولاد کا تعلق بڑا گہرا ہوتا ہے ؛ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس طرح مسلم والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ، اسی طرح غیر مسلم والدین کے ساتھ بھی حسن سلوک کا حکم دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا۔ (۱)

کہ (غیر مسلم) والدین کے ساتھ دنیا میں حسن سلوک کرتے رہنا۔

واضح ہو کہ جس طرح اولاد پر مسلم والدین کے حقوق ہیں، اگر والدین میں سے ایک یا دونوں غیر مسلم ہوں تو ان کے بھی اولاد پر وہی حقوق ہیں ؛ لہٰذا اولاد کو چاہئے کہ وہ اپنے غیر مسلم والدین کا ہر طرح سے خیال رکھیں، ان کے جذبات کا احترام کریں، ان کے ساتھ محبت سے پیش آئیں، ضرورت کے وقت ان کی مدد کریں، اگر وہ بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو ''اُف'' تک نہ کہیں ؛ کیوں کہ انھوں نے اولاد کی پرورش میں بڑے دُکھ درد جھیلے ہیں، صحیح بخاری ومسلم میں ہے :

عن اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما ، قالت : قدمت علی أمی وھی مشرکۃ فی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، فاستفیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، قلت : إن أمی وھی راغبۃ ، أفأصل أمی ؟ قال : نعم ، صلی امک ۔ (۲)

حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ میری والدہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں میرے پاس آئیں، اس وقت تک وہ مشرکہ تھیں اور وہ اس بات کی خواہش مند

☆ شعبۂ تحقیق : المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

(۱) لقمان:۱۵۔

(۲) صحیح بخاری، کتاب الہبۃ، باب الہدیۃ المشرکین، حدیث نمبر: ۲۶۲۰، صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، باب فضل النفقۃ، حدیث نمبر: ۱۰۰۳۔

تھی کہ میں ان کے ساتھ حسن سلوک کروں، میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا میں اپنی والدہ کے ساتھ (ان کے شرک کے باوجود) حسن سلوک کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، ان کے ساتھ حسن سلوک وصلہ رحمی کرو۔

ایک دوسری روایت میں ہے :

عن ابی سلمة وعن ابی هریرة، قالا : مر رسول الله صلی الله علیه وسلم علی عبد الله بن ابی ابن سلول وهو فی ظل اجمة، فقال : قد غبر علینا ابن ابی کبشة، فقال ابنه عبد الله بن عبد الله : والذی اکرمک والذی انزل علیک الکتاب ؛ لئن شئت لا تیتک برأسه، فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم : لا، ولکن بر اباک واحسن صحبته۔ (۱)

حضرت ابوسلمہ وحضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ کا گذر رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی بن سلول کے پاس سے ہوا، اس وقت وہ ایک گنجان درخت کے سائے میں بیٹھا ہوا تھا، تو اس نے کہا کہ ابن ابی کبشہ نے ہمیں گرد آلود کر دیا، اس پر اس کے لڑکے عبداللہ بن عبداللہ جو مسلمان ہو چکے تھے، آپ ﷺ سے کہا: اے اللہ کے رسول (ﷺ)! اس ذات کی قسم، جس نے آپ کو عزت بخشی اور اس ذات کی قسم جس نے آپ پر کتاب اُتاری، اگر آپ چاہیں تو میں ان کا (یعنی اپنے والد کا) سر آپ کی خدمت میں پیش کردوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نہیں، ایسا نہ کرو؛ بلکہ اپنے والد کے ساتھ نیکی کرو اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

کتاب وسنت کی ان تعلیمات سے واضح ہے کہ والدین خواہ کافر ومشرک ہوں، تب بھی دنیا میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔

فقہاء فرماتے ہیں کہ غیر مسلم والدین کے ساتھ بھی حسن سلوک کرنا فرض عین ہے؛ چنانچہ موسوعہ فقہیہ میں ہے :

البر بالوالدین فرض عین ... ولا یختص بکونهما مسلمین ؛
بل حتی لو کانا کافرین یجب برهما والاحسان الیهما۔ (۲)

---

(۱) صحیح ابن حبان: ۱/ ۳۲۸، باب حق الوالدین، حدیث نمبر: ۴۲۹۔

(۲) الموسوعة الفقهية: ۸/ ۶۵۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا فرض عین ہے اور یہ ان دونوں کے مسلمان ہونے کے ساتھ خاص نہیں ہے ؛ بلکہ اگر وہ دونوں کافر بھی ہوں تو ان کے ساتھ بھلائی اور حسن سلوک کرنا واجب ہے۔

البتہ انسان والدین کے ساتھ حسن سلوک میں اس حد تک نہ بڑھ جائے کہ اللہ کی نافرمانی ہونے لگے، یعنی انسان اپنے والدین کی اطاعت وفرمانبرداری صرف جائز اُمور میں کرے، اگر وہ خلاف شریعت کام اور اللہ کی ناراضگی والے اُمور کو انجام دینے کا حکم کریں تو پھر ان کی اطاعت جائز نہیں؛ کیوں کہ اگر مخلوق کی اطاعت سے اللہ کی نافرمانی ہوتی ہو تو اس میں ان کی اطاعت جائز نہیں۔(۱)

اللہ تبارک وتعالیٰ خود ارشاد فرماتا ہے :

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۔ (۲)

اور اگر وہ دونوں (ماں باپ) تجھ پر اس بات کا دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ شرک کرے، جس کا تجھے علم نہ ہو تو ان کا کہنا نہ ماننا۔

خلاصہ یہ کہ انسان اپنے والدین کی اطاعت اس حد تک کرے، جہاں تک شریعت اجازت دیتی ہو؛ لیکن اگر ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کی اطاعت وفرمانبرداری کرنے میں عقائد متأثر ہوتے ہوں، تو پھر ان کی پیروی جائز نہیں۔

غیر مسلم والدین کو دعوتِ اسلام دینے کا طریقہ

اگر کسی کے والدین کفر وشرک میں مبتلا ہوں تو اولاد کو چاہئے کہ وہ انھیں ادب واحترام کے ساتھ اسلام کی طرف دعوت دے اور ان کی اصلاح کے لئے اس طریقے کو اپنائے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کے لئے اپنایا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو نہایت ادب واحترام، شفقت ومحبت کے لہجہ میں بے راہ روی اور گمراہی پر متنبہ کیا، بے دھڑک یہ نہیں کہہ دیا کہ تم گمراہی میں پڑے ہوئے ہو؛ بلکہ ان کے باطل معبودوں کی بے بسی، کمزوری اور بے حسی کو مدلل طور پر ظاہر کیا :

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۔ (۳)

(۱) مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۱۰۷۔ (۲) لقمان: ۱۵۔ (۳) مریم: ۴۲۔

جب اس نے اپنے باپ سے کہا: کہ اے میرے والد! آپ کیوں ایسی چیز کی عبادت کرتے ہیں، جو نہ کچھ سنتی ہے اور نہ کچھ دیکھتی ہے، نہ آپ کے کام آتی ہے؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آپ کو عالم اور باپ کو صراحت کے ساتھ جاہل نہیں فرمایا؛ بلکہ ایک ہم سفر رفیق کی طرح راستہ بتانے کا اظہار کیا اور اپنے کو زیادہ راہ شناس بتایا؛ چنانچہ فرمایا :

يَٰٓأَبَتِ إِنِّي قَدْ جَآءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِيٓ أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۔ (۱)

اے میرے والد! میرے پاس ایسا علم پہنچا ہے، جو آپ کے پاس نہیں پہنچا، آپ میرے کہنے پر چلئے، میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔

پھر آگے فرمایا کہ جس راستہ پر آپ چل رہے ہیں، نہ صرف یہ کہ وہ نفع رساں نہیں ہے؛ بلکہ ضرر رساں بھی ہے، وہ شیطان کا راستہ ہے اور شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے؛ اس لئے اس کی پوجا نہ کریں؛ کیوں کہ اگر آپ نے شیطان کی پوجا کی تو آپ شیطان کے ساتھی ہوجائیں گے اور شیطان پر دنیا میں جو لعنت ہے، وہ آپ پر بھی ہوجائے گی اور آخرت میں جو عذاب شیطان پر ہوگا، وہ آپ پر بھی ہوگا، اس طرح آپ شیطان کے دوستوں میں شامل ہوجائیں گے :

يَٰٓأَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَٰنَ إِنَّ الشَّيْطَٰنَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا ، يَٰٓأَبَتِ إِنِّيٓ أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَٰنِ وَلِيًّا ۔ (۲)

اے میرے والد! آپ شیطان کی پوجا نہ کریں، بے شک شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے، اے میرے والد! مجھے ڈر ہے کہ رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب آپ پر (نہ) آجائے، پھر تو آپ شیطان کے ساتھی ہوجائیں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ اسلام نے اپنے والد کو بہت ہی نرمی، ادب اور اخلاق کے ساتھ یہ مشورہ دیا تھا اور ان کی اصلاح کی کوشش کی تھی؛ لیکن باپ نے کفر و جہالت کی وجہ سے انتہائی درشت کلامی، بدخلقی اور سختی کا مظاہرہ کیا، حضرت ابرہیم علیہ السلام نے کہا تھا ''اے میرے والد'' لیکن باپ نے میرے بیٹے کہنے کی جگہ بیٹے کا نام لے کر خطاب کیا، پھر دھمکی آمیز کلام کیا اور بطور تہدید کہا: کیا تو میرے معبودوں سے نفرت کرتا ہے؟ اگر تم باز نہیں آئے تو میں تجھے سنگسار کردوں گا اور برا بھلا کہہ کر تجھے نکال دوں گا :

(۱) مریم:۴۳۔ (۲) مریم:۴۴-۴۵۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا ۔ (۱)

ابراہیم کے والد نے کہا: اے ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے نفرت کرتا ہے، اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کردوں گا اور تو ہمیشہ کے لئے مجھے چھوڑ جا، (میرے پاس سے چلا جا)۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ڈرایا، دھمکایا اور گھر سے نکل جانے کو کہا تو اس حالت میں بھی انھوں نے بدسلوکی کا مظاہرہ نہیں کیا؛ بلکہ بہت ہی ادب واحترام سے کہا کہ میری طرف سے آپ کو دُکھ نہیں پہنچے گا، آپ کچھ بھی میرے ساتھ کریں، میں تو آپ کے لئے اپنے رب سے معافی کی درخواست کروں گا :

قَالَ سَلٰمٌ عَلَیْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا ۔ (۲)

ابراہیم نے کہا: آپ کو سلام! میں اپنے رب سے درخواست کروں گا کہ آپ کو معاف کردیں، بےشک وہ مجھ پر بڑے مہربان ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ انسان اپنے غیرمسلم والدین کے لئے اسی طریقہ کو اپنائے، جو حضرت ابرہیم علیہ السلام نے اپنایا، ایسا نہ ہو کہ ان کے شرک پر جمے رہنے کی وجہ سے ان سے قطع تعلق کرلیا جائے، ان کے سامنے بےادبی وگستاخی سے پیش آیا جائے؛ بلکہ موقع محل دیکھتے ہوئے ان کی اصلاح کی جائے اور ان کو اسلام کی دعوت دی جائے، اگر وہ اسلام قبول کرنے کو ناپسند کریں، یا اپنی اولاد کی بات ماننے سے انکار کریں تو اولاد کو چاہئے کہ وہ خاموش رہے اور اللہ سے ان کی ہدایت کی دُعا کرے، اللہ تبارک وتعالیٰ تمام باتوں کو جاننے والا اور تمام مصلحتوں سے واقف ہیں؛ چنانچہ ردالمحتار میں ہے :

اذا رأی منكرا من والديه يأمرها مرة، فان قبلا فبها، وإن كرها سكت عنهما، واشتغل بالدعا والاستغفار لهما، فان الله تعالیٰ يكفيه ما اهمه من امرهما ۔ (۳)

اگر کوئی اپنے والدین کی جانب سے کوئی ناپسندیدہ امر دیکھے تو ایک بار اس سے منع

---

(۱) مریم:۴۶۔

(۲) مریم:۴۷، مستفاد از: تفسیر مظہری:۶/۱۰۰۔

(۳) ردالمحتار: ۴/۷۸، کتاب الحدود، باب التعزیر۔

کرے، اگر وہ قبول کریں تو ٹھیک ہے اور اگر ناپسند کریں تو خاموش رہے اور ان
کے لئے دُعا واستغفار کرے، اللہ تعالیٰ والدین کے تعلق سے اس کے فکر وغم سے اس
کو کافی ہوجائے گا۔

غیر مسلم والدین کا نفقہ

اسلام کی آمد ہر طرح کی بھلائی وخیر خواہی، ہمدردی ورواداری، اُلفت ومحبت، تعاون وتکافل کے ساتھ ہوئی ہے، اس لئے یہ قانون بنادیا گیا کہ طاقتور کمزور پر رحم کرے، بڑے چھوٹے پر شفقت کریں، چھوٹے بڑے کی تعظیم کریں، مال دار غریب کو کھانا کھلائے، خوشحال تنگ دست کی مدد کرے، فراخی وتنگی ہر حالت میں اپنا مال ودولت خدا کی خوشنودی حاصل کرنے میں صرف کرے، پھر اس معاشرے کے نظام وقانون کو باقی رکھنے کے لئے اللہ رب العزت نے اول ہی دن سے لوگوں کے درمیان تعلق ورشتہ کو مضبوط فرمایا، خواہ وہ رشتہ باپ بیٹے کی شکل میں ہو، ماں اور بیٹی یا بھائی اور بہن کی شکل میں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـًٔا وَّ بِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّ بِذِی الۡقُرۡبٰی ۔ (۱)

اورتم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور ماں باپ کے
ساتھ بہتر سلوک کرو اور اہل قرابت کے ساتھ بھی۔

چنانچہ ادائیگیٔ حقوق میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے بعد اگر کسی کا حق ہے تو ماں باپ کا حق ہے؛ کیوں کہ وہی انسان کے ظاہری وجود کا سبب ہیں اور اس کی پرورش کا ذریعہ ہیں؛ لہٰذا اولاد کے بالغ ہونے اور کسبِ معاش پر قادر ہونے کے بعد اس پر اس کے تنگ دست والدین کا نفقہ واجب ہوتا ہے، والدین خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر— غیر مسلم والدین کے نفقہ کے سلسلہ میں علماء اسلام نے قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال کیا ہے :

وَ صَاحِبۡهُمَا فِی الدُّنۡيَا مَعۡرُوۡفًا ۔ (۲)

اور دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا۔

مشہور عالم دین شیخ وہبہ زحیلی اس آیت کی تفسیر فرماتے ہیں کہ غیر مسلم والدین کے ساتھ بھلائی یہ ہے کہ تم ان کے ساتھ بہتر سلوک کرو، فقر وفاقہ اور تنگ دستی میں ان کی مدد کرو، انھیں کھلاؤ، پہناؤ، بیماری کی حالت میں ان کا علاج کراؤ :

(۱) النساء:۳۶۔ (۲) لقمان:۱۵۔

ان لصاحبهما فی الدنیا بالمعروف بأن تحسن الیهما فتمد هما بالمال عند الحاجة وتطعمهما وتکسوهما وتعالجهما عند المرض ۔ (۱)

دنیا میں ان دونوں (غیر مسلم والدین) کے ساتھ بھلائی کرنا یہ ہے کہ تم ان دونوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، ضرورت کے وقت مال سے ان کی مدد کرو، انھیں کھلاؤ، پہناؤ اور بیماری کی حالت میں ان کا علاج کرواؤ۔

علامہ ابن منذرؒ فرماتے ہیں :

اجمع العلماء علی وجوب النفقة للوالدین اللذین لا کسب لهما ولا مال ، سواء أکان الوالدان مسلمین أو کافرین ۔ (۲)

علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اولاد پر اس کے تنگ دست والدین کا نفقہ واجب ہے، خواہ والدین مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔

اولاد پر جس طرح غیر مسلم والدین کا نفقہ واجب ہے، غیر مسلم دادا، دادی، نانا، نانی کا بھی نفقہ واجب ہے، دادا، دادی، نانا، نانی کا نفقہ اس وقت واجب ہوگا؛ جب کہ وہ تنگ دست ہوں اور ان کی کوئی اولاد نہ ہو؛ بلکہ صرف پوتا، پوتی، نواسا، نواسی ہو، علامہ مرغینانی رقم طراز ہیں :

وعلی الرجل أن ینفق علی أبویه وأجداده وجداته إذا کانوا فقراء و إن خالفوه فی دینه ۔ (۳)

انسان پر ان کے والدین، دادا، دادی، نانا، نانی پر خرچ کرنا واجب ہے، اگر وہ تنگ دست ہوں، اگر چہ ان کا مذہب الگ ہو۔

البتہ اگر غیر مسلم والدین حربی ہوں، یعنی وہ ایسے ملک میں ہوں، جس ملک سے مسلمانوں کی جنگ چل رہی ہو تو مسلم اولاد پر حربی والدین کا نفقہ واجب نہیں ہوگا، اسی طرح اگر حربی والدین دارالاسلام میں امان لے لیں، جب بھی اولاد پر ان کا نفقہ واجب نہیں، اسی طرح اگر کسی کا لڑکا یا لڑکی حربی ہو اور وہ دارالاسلام میں امان لے لے اور دارالاسلام میں اس کے تنگ دست والدین ہوں تو لڑکے یا لڑکی کو ان کے والدین کے نفقہ کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا :

(۱) تفسیر منیر: ۲۱/۱۴۷، تفسیر قرطبی: ۷/۴۳، بدائع الصنائع: ۳/۴۳۹۔

(۲) الموسوعۃ الفقہیۃ: ۲/۲۵۹، نیز دیکھئے: الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۷/۴۴۴۔

(۳) الہدایہ: ۲/۴۴۵، باب النفقہ، الفتاویٰ الہندیہ: ۱/۴۴۴، کتاب المجموع: ۲۰/۱۳۷۔

ولا يجبر المسلم والذمى على نفقة والديه من أهل الحرب ، وإن كانا مستأمنين فى دارالاسلام ، وكذا الحربى الذى دخل علينا بأمان لا يجبر على نفقة والديه إذا كانا مسلمين ، أوكانا من أهل الذمة ـ (۱)

اور مسلمان یا ذمی کو اپنے والدین کے نفقہ کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا؛ اگر چہ اس کے والدین دارالاسلام میں امان (اجازت) لے کر آئے ہوں، اسی طرح اگر حربی دارالاسلام میں امان لے کر آیا ہو تو اس کو اپنے مسلم یا ذمی والدین کا نفقہ ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

غیر مسلم والدین کو زکوٰۃ وصدقات دینا

غیر مسلموں کو زکوٰۃ کا مال وغیرہ دینا جائز نہیں، چاہے وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو؛ کیوں کہ زکوٰۃ مسلمان فقراء کا حق ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت معاذؓ کو یمن بھیجتے وقت فرمایا تھا کہ تم ایسے لوگوں کے پاس جا رہے ہو جو اہل کتاب ہیں، اول انھیں ''لا إلہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کی شہادت کی طرف دعوت دینا، اگر وہ مان لیں تو ان کو بتانا کہ اللہ نے ان پر دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اگر وہ یہ بھی مان لیں تو ان کو بتانا کہ اللہ نے ان پر زکوۃ فرض کی ہے، جو ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان ہی کے فقراء پر تقسیم کی جائے گی۔(۲)

اس حدیث کی رو سے زکوۃ لینے والے کا مسلمان ہونا ضروری ہے، غیر مسلم کو زکوۃ کا مال وغیرہ نہ دینے پر فقہاء کا اتفاق ہے۔

ولا خلاف فى أن زكاة المال لا يجوز دفعها إلى غير المسلمين ـ (۳)

اس میں اختلاف نہیں ہے کہ مالِ زکوٰۃ غیر مسلموں کو دینا جائز نہیں۔

البتہ اسلام نے غیر مسلموں (خواہ والدین ہوں یا کوئی اور) کے ساتھ عام انسانی ہمدردی اور تعاون سے منع نہیں کیا؛ بلکہ ان کے لئے صدقات نافلہ اور ہدیہ وہبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے کہ اگر وہ تنگ دست ومحتاج ہوں تو ان کی مدد ان ذرائع سے کی جاسکتی ہے، جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے :

(۱) الفتاویٰ الہندیہ: ۱/ ۵۶۸۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر: ۱۳۹۵۔

(۳) الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۳/ ۶۳۔

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔ (۱)

اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور عدل وانصاف کا برتاؤ کرو، جنھوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا، اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والے کو پسند کرتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم کی اس آیت میں رہنمائی فرمائی ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم تمہارے ساتھ نرمی اور رواداری سے پیش آئے تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تم بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اسلام کی تعلیم یہ نہیں کہ اگر کافروں کی ایک قوم مسلمانوں سے عداوت رکھے اور ان سے جنگ وجدال کرے تو تمام کافروں کو بلاتمیز ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا شروع کردیں؛ بلکہ ایسا کرنا شریعت کے مزاج، حکمت اور انصاف کے خلاف ہے۔

حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ فرماتی ہیں کہ میری ماں مشرکہ تھیں، مجھ سے ملنے آئیں، میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ وہ مجھ سے کچھ توقع لے کر آئی ہیں، کیا میں ان کے ساتھ تعاون اور ہمدردی کرسکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو؛ (۲) چنانچہ فقہاء ان نصوص کی روشنی میں فرماتے ہیں کہ غیر مسلم کو (خواہ والدین ہوں یا کوئی اور) صدقات نافلہ دینا جائز ہے :

وتحل الصدقة أيضا على فاسق وكافر من يهودي أو نصراني أو مجوسي، ذمي أو حربي ۔ (۳)

اور فاسق وکافر کو خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی یا آتش پرست، ذمی ہو یا حربی، صدقہ دینا جائز ہے۔

احناف کے نزدیک غیر مسلموں کو صدقات واجبہ بشمول صدقۃ الفطر دینا بھی جائز ہے۔ (۴)

جہاد کے لئے غیر مسلم والدین سے اجازت

اگر جہاد فرض کفایہ کے درجہ میں ہو اور غیر مسلم والدین جہاد سے منع کریں اور اس میں شریک ہونے کی اجازت نہ دیں تو کیا ان کی اطاعت لازم ہے؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے درمیان دو آراء ہیں :

---

(۱) الممتحنة: ۸۔
(۲) صحیح البخاری، باب صلة الوالد المشرک، حدیث نمبر: ۵۹۷۸۔
(۳) الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۳/۷۱۔
(۴) بدائع الصنائع: ۲/۲۰۷، رد المحتار: ۳/۳۲۵۔

(۱) امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے نزدیک اولاد کے لئے غیر مسلم والدین کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک ہونا جائز ہے، ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے بدر کے دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مل کر کفار مکہ کے خلاف جنگ لڑی؛ حالاں کہ اس میں بہت سے صحابہ ایسے تھے، جن کے والدین مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے، جیسے: حضرت ابوبکر صدیقؓ کے والد، حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ کے والد وغیرہ؛ مگر کسی صحابی نے جہاد کے لئے اپنے والدین سے اجازت نہیں لی:

فأما إن كان أبواه غير مسلمين فلا إذن لهما ۔ (۱)

اوران سے اجازت لینا اس اعتبار سے بھی درست نہیں کہ کافر جہاد سے روکنے کے سلسلہ میں مقام تہمت میں ہے اور غالب گمان یہی ہے کہ وہ اسلام کو کمزور کرنے کا ارادہ سے منع کررہے ہوں گے:

ولأن الكافر متهم في الدين بالمنع من الجهاد لمظنه قصد توهين الاسلام ۔ (۲)

اور اس لئے کہ کافر جہاد سے روکنے کے سلسلہ میں مذہبی اعتبار سے متہم ہے اور ظن غالب ہے کہ اسلام کو کمزور کرنے کے ارادہ سے ان کا منع کرنا ہو۔

(۲) احناف دو شرطوں کے ساتھ غیر مسلم والدین کی اجازت لازم قرار دیتے ہیں، یعنی اگر وہ دونوں شرطیں پائی جائیں تو اولاد کے لئے اپنے غیر مسلم والدین کی اجازت کے بغیر فرض کفایہ کے درجہ کے جہاد میں شریک ہونا جائز نہیں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ والدین تنگ دست ہوں اوران کا نفقہ مسلم اولاد پر واجب ہو، نیز اولاد کے جہاد میں جانے سے ان کی جان جانے کا خطرہ ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ انھیں خود اپنے سلسلہ میں خدشہ ہو کہ اگر اولاد ان کو چھوڑ کر گئی تو وہ مشقت میں پڑ جائیں گے؛ لہٰذا ان دونوں شرائط کے پائے جانے کی صورت میں اولاد کے لئے غیر مسلم والدین کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک ہونا جائز نہیں۔

احناف کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اور اللہ کے رسول ﷺ نے جائز اُمور میں والدین کی اطاعت اوران کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور اس حکم میں مسلم والدین اور غیر مسلم والدین دونوں شامل ہیں؛ لہٰذا جس طرح مسلم والدین کی اجازت ضروری ہے، غیر مسلم والدین کی اجازت بھی ضروری ہے:

---

(۱) المغنی: ۲۶/۱۲، کتاب الجهاد، مسئلة إذا كان المنطوع للجهاد ابواه مسلمين ۔

(۲) الموسوعۃ الفقہیہ: ۱۳۳/۶۔

و إن كان أبواه كافرين أو أحدهما وهو مسلم وكرها خروجه أو الكافر منهما إذ كان لمخافته على نفسه أو تلحقه مشقة لا يخرج إلا بأذنهما ۔ (۱)

اور اگر اس کے ماں باپ یا ان میں سے کوئی ایک کافر ہو اور وہ مسلمان ہو اور وہ دونوں یا ان میں سے جو کافر ہے وہ اس کے نکلنے کو ناپسند کرے تو اگر ان کا ناپسند کرنا ان کے جان خطرہ میں پڑ جانے یا مشقت سے دو چار ہونے کی وجہ سے ہے تو وہ ان کی اجازت کے بغیر نہ نکلے۔

اگر یہ دونوں شرطیں نہ پائی جائیں؛ بلکہ والدین اسلام کو کمزور کرنے کے لئے منع کریں، تو تمام فقہاء کے نزدیک ان کی اطاعت لازم نہیں؛ بلکہ ان کی اجازت کے بغیر فرض کفایہ درجہ کے جہاد میں شریک ہونا جائز ہے :

و إلا بل لكراهة قتال أهل دينه ، فلا يطيعه مالم يخف عليه الضيعة ۔ (۲)

اور اگر ان کا یہ ناپسند کرنا ان کے ہم مذہب سے جہاد کرنے کی وجہ سے ہے تو وہ ان کی اطاعت نہ کرے، سوائے اس کے کہ جہاد میں جانے کی وجہ سے والدین کی موت کا اندیشہ ہو۔

میدانِ جنگ میں غیر مسلم والد کے ساتھ برتاؤ

مسلم اولاد کا غیر مسلم والد سے اگر میدان جنگ میں سامنا ہو جائے تو میدانِ جنگ میں بھی اولاد کو چاہئے کہ ان پر ہتھیار نہ اُٹھائے اور نہ ان کو قتل کرنے کی کوشش کرے :

إن الاحسان إلى الوالدين هو ... أن لا يشتهر عليهما سلاحا ولا يقتلهما ۔ (۳)

اور والدین کے ساتھ حسن سلوک میں یہ بھی شامل ہے کہ ان پر ہتھیار نہ اُٹھائے اور نہ ہی انھیں قتل کرے۔

(۱) البحر العمیق: ۱/ ۳۸۸، کتاب الثالث فی مناسک الحج، شرائط وجوب الأداء، ردالمحتار: ۶/ ۲۰۲، الفتاویٰ الولوالجیۃ: ۲/ ۲۹۴۔

(۲) ردالمحتار: ۶/ ۲۰۲، کتاب الجہاد۔

(۳) مفاتیح الغیب: ۵/ ۲۰۵، سورہ نساء: ۳۶۔

حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت حنظلہ بن ابی عامر راہب کو ان کے مشرک والد کو قتل کرنے سے منع فرمادیا تھا :

روی أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی حنظلة بن أبی عامر الراھب عن قتل أبیہ وکان مشرکا۔ (۱)

البتہ اندیشہ ہونے لگے کہ اگر اس نے اپنے والد کو قتل نہیں کیا تو خود اس کی جان چلی جائے گی، تو ایسے وقت میں اپنے والد پر ہتھیار اُٹھانا اور اپنا دفاع کرنا جائز ہے، اگر اس نے ایسا نہیں کیا اور اس کے والد نے بڑھ کر اسے قتل کر دیا، تو دوسرے کو اپنے اوپر قدرت دے کر خود کو قتل کرنے والا سمجھا جائے گا اور شریعت میں یہ جائز نہیں ہے، امام ابوبکر رازی رقم طراز ہیں :

أن یضطر إلی ذٰلک بأن یخاف أن یقتلہ إن ترک قتلہ ، فحینئذ یجوز لہ قتلہ ؛ لأنہ إذا لم یفعل ذٰلک کان قد قتل نفسہ بتمکین غیرہ منہ ۔ (۲)

اگر وہ اس پر مجبور ہو جائے اس طور پر کہ اسے اندیشہ ہو کہ اگر اس نے اس کو قتل نہیں کیا، یا اسے چھوڑ دیا تو وہ اسے قتل کر دے گا تو اس وقت اس کے لئے اس کو قتل کرنا جائز ہے؛ اس لئے کہ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو دوسرے کو اپنے اوپر قدرت دے کر خود کو قتل کرنے والا سمجھا جائے گا۔

میراث میں غیر مسلم والدین کا حق نہیں

اسلام نے میراث کا جو قانون مقرر کیا ہے ، اس میں ایک شرط یہ رکھی ہے کہ وارث اور مورث دونوں مسلمان ہوں، اللہ کے حبیب جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم ۔ (۳)

نہ مسلمان کسی کافر کا وارث ہوسکتا ہے اور نہ کافر کسی مسلمان کا۔

---

(۱) مفاتیح الغیب: ۵/ ۲۰۵، سورۂ نساء، آیت نمبر: ۳۶۔

(۲) مفاتیح الغیب: ۵/ ۲۰۵، سورۂ نساء، آیت نمبر: ۳۶۔

(۳) سنن الترمذی، ابواب الفرائض، حدیث نمبر: ۲۱۰۷۔

ایک دوسری حدیث میں ہے :

عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال : لا یتوارث اہل الملتین ۔ (۱)

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: دو الگ الگ مذہب کو ماننے والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے۔

البتہ اسلام کی نمایاں صفات میں سے یہ ہے کہ اس نے ان رشتہ داروں کے لئے جنھیں وراثت میں حق نہیں ملتا، ''وصیت'' کا باب کھلا رکھا ہے؛ لہٰذا غیر مسلم والدین یا دوسرے رشتہ دار جو وراثت کا حق نہیں رکھتے ان کے حق میں وصیت کی جاسکتی ہے؛ البتہ زیادہ سے زیادہ ثلث (تہائی) مال ہی کی وصیت کرسکتا ہے؛ تاکہ ورثہ کے ساتھ ناانصافی نہ ہوجائے، حدیث میں ہے کہ حضرت سعد بن وقاصؓ تہائی مال سے زیادہ میں وصیت کرنا چاہتے تھے؛ لیکن آپ ﷺ نے انھیں تہائی سے زیادہ میں وصیت کی اجازت نہیں دی۔(۲)

لہٰذا اگر کسی کے غیر مسلم والدین ضرورت مند ہوں اور مسلم اولاد صاحب ثروت ہو تو انھیں چاہئے کہ وہ اپنے غیر مسلم والدین کے لئے تہائی مال میں وصیت کرجائے؛ کیوں کہ غیر مسلم والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا فرض ہے اور حسن سلوک کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ماں باپ کو تنگ دست وضرورت مند نہ چھوڑے؛ بلکہ مرتے مرتے ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا جائے :

ویجوز ان یوصی المسلم للکافر والکافر للمسلم ۔ (۳)

مسلمان کا کافر کے لئے وصیت کرنا جائز ہے اور کافر کا مسلمان کے لئے۔

وفات کے بعد غیر مسلم والدین کی تجہیز وتکفین

والدین اگر حالت کفر میں وفات پاجائیں تو مسلم اولاد کو چاہئے کہ وہ وفات کے بعد بھی ان کے ساتھ بہتر سلوک کرے، انھیں غسل دے، کفن پہنائے اور کہیں گڑھا کھود کر اس میں انھیں دفن کردے۔

حدیث میں ہے کہ حضرت علیؓ اپنے والد ابوطالب کی وفات کے بعد اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کے چچا کا انتقال ہوچکا ہے، آپ ﷺ نے

---

(۱) سنن الترمذی، حدیث نمبر:۲۱۰۸۔

(۲) صحیح البخاری، حدیث نمبر:۱۳۹۵، کتاب الجنائز۔

(۳) البنایہ:۱۳/۴۰۰، کتاب الوصایا، المبسوط:۲۷/۱۵۲، کتاب الوصایا۔

حضرت علیؓ سے فرمایا: تم جاؤ، انھیں غسل دو، انھیں کفن پہناؤ اور انھیں (زمین میں) چھپادو اور کسی سے کوئی گفتگو کئے بغیر مجھ سے ملو، حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب میں مذکورہ تمام اُمور کو انجام دینے کے بعد اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے مجھے ایسی دُعاؤں سے نوازا، جو میرے نزدیک سرخ اُونٹوں سے بہتر ہیں۔(۱)

علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان اپنے مشرک باپ کی وفات کے بعد انھیں غسل دے اور تجہیز وتکفین کے بعد انھیں دفن کردے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں؛ بلکہ حسن سلوک کے طور پر ایسا کرنا مستحب ہے :

ولا بأس بأن يغسل المسلم أباه الكافر إذا مات ويدفنه ...
والولد المسلم مندوب إلى بر والده وإن كان مشركاً۔(۲)

اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ مسلمان شخص اپنے غیر مسلم والد کو غسل دے جب وہ مرجائے اور اس کی تدفین کرے...... مسلمان اولاد کا اپنے غیر مسلم والد کے ساتھ حسن سلوک کرنا مستحب ہے۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ غیر مسلم کو مسلمان میت کی طرح غسل نہیں دیا جائے گا؛ بلکہ اس پر صرف پانی بہادیا جائے گا، اسی طرح ان کی تجہیز وتکفین بھی سنت کے طریقے پر نہیں کی جائے گی، یعنی مسلمان میت کی جس طرح تجہیز وتکفین کرتے ہیں کہ مرد کو تین کپڑے اور عورت کو پانچ کپڑے میں کفناتے ہیں ویسا کرنا ضروری نہیں؛ بلکہ کسی بھی کپڑے میں اس طرح لپیٹ دیا جائے گا کہ ستر ڈھک جائے، اسی طرح ان پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، ان کے لئے اس طرح کی قبر کھودنا ضروری نہیں، جیسا کہ مسلمان میت کے لئے کھودی جاتی ہے :

إنما يغسل غسل الثوب النجس من غير وضوء ولا يكون الغسل طهارة له ؛ حتى لو حمله إنسان وصلى لم يجز صلاته ويلف في خرقة بلا اعتبار عدد ولا حنوط ولا كافور ويحفر له حفيرة من غير مراعاة سنة اللحد ۔ (۳)

اور اگر کسی کے والدین نے حالت ارتداد میں وفات پائی تو پھر اس کو نہ غسل دیا جائے گا اور نہ ہی الگ سے ان کی تجہیز وتکفین کی جائے گی؛ بلکہ اسی کپڑے میں ایک گڑھا کھود کر اس میں اسے ڈال دیا جائے گا، نیز جس مذہب کو اس نے اختیار کیا ہے، اس کے ماننے والوں کو اس کی نعش حوالہ نہیں کی جائے گی :

(۱) مسند احمد: ۱/ ۱۱۹-۱۲۵، مسند علی بن ابی طالب، ط: مکتبہ اسلامی بیروت۔
(۲) المبسوط للسرخسی: ۲/ ۵۵، کتاب الصلاۃ، باب الشہید۔ (۳) ردالمحتار: ۳/ ۱۳۴، باب صلاۃ الجنائز، البحر الرائق: ۲/ ۲۳۴، کتاب الجنائز، فتح القدیر: ۲/ ۱۳۸، کتاب الصلاۃ، عنایۃ علی ہامش فتح القدیر: ۲/ ۱۳۸، اعلاء السنن: ۸/ ۲۸۲۔

و أما المرتد فلا يغسل ولا يكفن و إنما يلقى في حفرة كالكلب ولا يدفع إلى من انتقل إلى دينهم ۔ (۱)

غیر مسلم والدین کے لئے استغفار

اگر کسی کے والدین مشرک ہوں اور کفر کی حالت میں ان کا انتقال ہوگیا ہو؛ لیکن ان کی اولاد کو ایمان لانے کی توفیق ہوئی تو اس کے لئے اپنے کافر والدین کے لئے دُعا و استغفار اور ایصالِ ثواب جائز نہیں؛ کیوں کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے جو شخص حالت کفر میں مرتا ہے، وہ خدا کا باغی اور اس کا دشمن ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے بے تعلقی برتی جائے، نیز اس سے بے تعلقی برتنا، بے مروتی و ناروا داری نہیں؛ بلکہ یہ ایک طرح کا انصاف و وفا شعاری ہے؛ کیوں کہ ہم دن رات دیکھتے ہیں کہ ملکوں اور حکومتوں کے باغیوں کو سزائے موت دی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہمدردی کو غداری باور کیا جاتا ہے، پس رب کائنات سے تمام انسانوں کا جو رشتہ ہے، وہ بندگی کا ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے شخص کو معاشرے کا باغی تصور کیا جائے اور اس سے بے تعلقی برتی جائے، خود اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی میں یہ مثال ملتی ہے کہ جب آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کا انتقال ہوا اور آپ ﷺ نے ان کے لئے دُعا مغفرت کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے چچا کے لئے دُعاء و استغفار کرنے سے منع فرما دیا :

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۔ (۲)

نبی اور اہل ایمان کے لئے روا نہیں کہ مشرکین کے لئے یہ بات ظاہر ہو جانے کے بعد کہ وہ دوزخی ہیں، دُعاء و استغفار کریں گو وہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی بھی کافر کے لئے خواہ والدین ہوں یا کوئی اور، استغفار کرنا جائز نہیں ہے۔

عصر حاضر کے مشہور مفسر شیخ وہبہ زحیلیؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جو شخص حالت کفر میں مرے، اس کے لئے مغفرت و رحمت کی دُعا کرنا یا اس کے لئے مغفور و مرحوم جیسے الفاظ کا استعمال کرنا جائز نہیں، جیسا کہ بعض جہلاء کرتے ہیں :

تحريم الدعاء لمن مات كافرا، بالمغفرة والرحمة، أو بوصفه بذلك كقولهم : المغفور له والمرحوم فلان كما يغفل بعض الجهلة ۔ (۳)

---

(۱) ردالمحتار: ۳/ ۱۳۴، باب صلاۃ الجنازۃ، اوجز المسالک: ۴/ ۳۸۹، عمدۃ القاری: ۶/ ۸۶، حدیث نمبر: ۱۲۶۹، کتاب الجنائز۔

(۲) التوبۃ: ۱۱۳۔ (۳) تفسیر المنیر: ۱۱/ ۶۲، سورۂ توبہ: ۱۱۳۔

حالتِ کفر میں مرنے والے شخص کے لئے مغفرت اور رحمت کی دُعا کرنا یا اس جیسے الفاظ سے متصف کرنا مثلاً مغفور لہ یا مرحوم کہنا جیسا کہ بعض جہلاء کرتے ہیں، حرام ہے۔

غیر مسلم والدین کی قبر کی زیارت

غیر مسلم والدین کی قبر کی زیارت کرنا جائز ہے، حدیث میں ہے :

عن ابی ھریرۃ قال : قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم : استأذنت ربی أن استغفر لأمی فلم یأذن لی ، واستأذنته أن أزور قبرھا فأذن لی ۔ (۱)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں نے اپنے پروردگار سے اپنی والدہ کے لئے استغفار کی اجازت چاہی تو اللہ نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی، پھر میں نے ان کی قبر کی زیارت کی اجازت مانگی تو اللہ نے مجھے اس کی اجازت دے دی۔

قاضی عیاض اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں :

استئذانه علیه السلام فی زیارۃ قبر أمه والإذن فی ذلک دلیل علی جواز زیارۃ القبور ، وصلة الآباء المشرکین ۔ (۲)

آپ علیہ السلام کا اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کے سلسلہ میں اجازت طلب کرنا اور اس میں اجازت کا ملنا، غیر مسلم والدین کی صلہ رحمی اور قبر کی زیارت کے جواز کی دلیل ہے۔

نیز عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ تحریر فرماتے ہیں :

ففیه دلیل علی جواز زیارۃ قبر القریب الذی لم یدرک الاسلام ۔ (۳)

اس حدیث میں ایسے رشتہ دار کی قبر کی زیارت کے جواز کی دلیل ہے، جس نے اسلام کا زمانہ نہ پایا ہو۔

● ● ●

(۱) صحیح مسلم، کتاب الجنائز، حدیث نمبر: ۲۲۵۸۔
(۲) اکمال المنعم بفوائد مسلم: ۳/ ۴۵۲۔
(۳) تحفۃ الاحوذی: ۴/ ۱۳۵۔

جرح وتعدیل کی کتابوں پر ایک ناقدانہ نظر(۱)

احناف کے خلاف عقیلیؒ اور ابن عدیؒ کی بے جا اور ظالمانہ تنقید

تالیف: علامہ زاہد الکوثریؒ
ترجمہ: مولانا محمد انوار خان قاسمی بستوی

عقیلیؒ کی کتاب ''الضعفاء الکبیر'' اور اسی طرح سے ابن عدیؒ کی کتاب ''الکامل فی ضعفاء الرجال'' میں ہمارے ائمہ فقہ، احناف کے بارے میں تعصب کی بنا پر کافی جرح موجود ہے، عقیلیؒ نے ایسا اس لئے کیا ہے کیوں کہ یہ شخص حشویہ کے انداز پر فاسد اعتقادات کا حامل تھا اور ابن عدیؒ ایسا اس لئے کرتا تھا؛ کیوں کہ یہ شخص جاہلانہ مذہبی تعصب کا شکار تھا اور ساتھ ساتھ بد اعتقاد بھی تھا، ان دونوں کے بعد آنے والے لوگ یا تو جہالت اور یا تو عصبیت میں اندھا ہو کر انھیں کے نقش قدم پر چلتے رہے۔

---

(۱) اس کتاب میں اس عنوان کے تحت امام کوثریؒ نے جو کچھ لکھا ہے حقیقت یہ کہ یہ بس آپ ہی کا حصہ ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جرح وتعدیل کی کتابوں اور اسی طرح سے اس فن کے ائمہ کے منہج مزاج اور کمزوریوں پر امام کوثریؒ کتنی عمیق نظر رکھتے تھے، جرح وتعدیل سے متعلق امام کوثریؒ کا یہ پورا کلام علم حدیث سے اشتغال رکھنے والے علماء اور طلبہ کے لئے حرزِ جاں بنانے کے لائق ہے، امام کوثریؒ سے قبل کسی اور محدث اور ناقد نے اتنے مدلل، منقح، جامع اور مختصر انداز سے اس موضوع پر قلم نہیں اُٹھایا، کاش کوئی شخص امام کوثریؒ کی اس بحث کو دکتوراہ (ڈاکٹریٹ) یا ماجستیر (ایم اے) کا موضوع بناتا اور تمام شواہد اور مثالوں کے ساتھ امام کوثریؒ کے ان اقوال کا مقارنہ اور تجزیہ کرتا تو واقعی یہ ایک بہت بڑی علمی خدمت ہوتی۔

بعض جاہل قسم کے سلفیوں نے علماء جرح وتعدیل پر امام کوثریؒ کی اس تنقید کو ظلم اور تعصب قرار دیا ہے؛ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ امام کوثریؒ کی یہ تنقید خالص علمی، تعمیری اور مبنی بر حقیقت ہے، اکابر جرح وتعدیل بہر حال انسان تھے اور یہ حضرات بھی اپنے گرد وپیش کے علمی اور فکری ماحول سے متاثر ہو جاتے تھے اور بسا اوقات ایسے شخص کو مجروح قرار دے دیتے تھے جو جرح وتنقید سے بالکل بالاتر ہوتا اور بعض دفعہ مجروح جارح سے بدر جہا افضل، اعلم اور اورع ہوتا ہے، جرح وتعدیل کی کتابیں اس طرح کے شواہد سے بھری پڑی ہیں، بہر حال کسی کی جرح یا تعدیل قبول کرنے سے پہلے خود اس کی شخصیت پر نظر ڈالنا، اس کی تنقید اور تجریح کو اچھی طرح سے چھان پھٹک کے بعد قبول کرنا ہی مناسب ہے۔

جو شخص بھی اس ڈگر پر چلے گا، وہ اپنے علاوہ کسی اور کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا اور جو شخص بھی کسی کے مقام کو گرانے کی کوشش کرے گا، وہ خود ہی حقیر و ذلیل ہو جائے گا، امام شافعیؒ کے شیخ ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ اسلمیؒ کے بارے میں ابن عدیؒ کا قول ذرا ملاحظہ تو فرمائیں :

میں نے اس کی (یعنی اسلمی کی) احادیث میں غور کیا اور مجھے اس کی کوئی بھی منکر حدیث نہ ملی۔

حالاں کہ سارے لوگ اس شخص کے بارے میں علماء نقد جیسے احمدؒ اور ابن حبانؒ کی رائے سے واقف ہیں، امام عجلیؒ فرماتے ہیں :

ابرہیم اسلمیؒ مدینہ کا رہنے والا، رافضی، جہمی اور قدری شخص ہے، اس کی حدیث نہیں لکھی جائے گی۔

یہی نہیں؛ بلکہ بہت سے ناقدین نے اسلمیؒ کی تکذیب تک کی ہے، اگر امام شافعیؒ اسلمیؒ سے بکثرت روایت حدیث نہ فرماتے جتنا کہ وہ امام مالکؒ سے روایت کیا کرتے تھے، تو ابن عدیؒ ابن عقدہؒ جیسے لوگوں کے قول پر اعتماد کرتے ہوئے اسلمیؒ کے توثیق کی بالکل کوشش نہ کرتا۔

میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ابن عدیؒ اپنی زبان چلانے میں اتنی جرأت کیسے کر لے جاتا ہے، اس شخص نے جسارت کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ لوگوں کو محمد بن الحسنؒ جیسے شخص کے علم کی کوئی ضرورت نہیں، جب کہ خود ابن عدیؒ کے امام یعنی امام شافعیؒ آپ کے علم سے مستغنی نہ رہ سکے؛ بلکہ آپ ہی کے یہاں فقہ میں زانوئے تلمذ تہہ کیا؛ لیکن 'تشبع بما لم یعط' کا مریض ہر عالم کے علم سے استغنا کا اظہار کرتا ہے اور اپنی جہالتوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا ہے اور ایسے شخص کو آگے پیچھے کچھ بھی نظر نہیں آتا ہے، ابن عدیؒ نے یہ ناروا سلوک ہمارے تمام علماء کے ساتھ کیا ہے، دُعا ہے کہ اللہ رب العزت کے حضور روزِ قیامت یہ حضرات اس شخص کو معاف کر دیں۔

ابن عدیؒ کی کتاب ''الکامل فی ضعفاء الرجال'' کا ایک بہت بڑا عیب یہ ہے کہ اس کا مؤلف کسی بھی حدیث کی بنا پر کسی شخص کو مجروح قرار دے دیتا ہے؛ حالاں کہ اس حدیث میں خرابی اس شخص سے روایت کرنے والے دوسرے راوی کی وجہ سے ہوتی ہے نہ کہ خود اسی شخص سے، امام ذہبیؒ نے اپنی کتاب ''میزان الاعتدال فی نقد الرجال'' میں کئی مقامات پر اس عیب کی نشاندہی کی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی مرویات ــــ جن کی تعداد ابن عدیؒ کے یہاں تین سو تک پہنچتی ہے ــــ پر ابن عدیؒ کی تنقید اور جرح اسی قبیل سے ہے، یہ تمام روایتیں دراصل اباء ابن جعفر نجیرمی سے مروی ہیں اور ان تمام احادیث میں

جومواخذات پائی جاتی ہیں، وہ سب اسی خاص راوی کی وجہ سے ہیں، جو ابن عدیؒ کے مشائخ میں سے ہے، ابن عدیؒ نجیرمی کی ساری غلطیاں براہِ راست ابوحنیفہؒ پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتا ہے اور واقعی یہ ظلم اور تجاوز عن الحد کی انتہا ہے، امام ابوحنیفہؒ پر ابن عدیؒ کے دوسری مواخذات بھی اسی قبیل سے ہیں، اس طرح کی باتوں کا پتہ لگانے کا سب سے بہتر طریقہ ان احادیث کی اسانید کی تفتیش ہے۔(۱)

عقیلیؒ کے بارے میں ہم نے امام ذہبیؒ کا تبصرہ ''انتقاد المغنی'' کے مقدمے میں نقل کر دیا ہے اور اس شخص کے بارے میں ہم اس سے پہلے بھی کلام کر چکے ہیں۔(۲)

جرح وتعدیل پر امام بخاریؒ کی کتابوں سے استفادہ کرتے وقت احتیاط

رہا مسئلہ جرح وتعدیل کے موضوع پر امام بخاریؒ کی کتابوں کا تو یاد رکھیں یہ کتابیں جامع صحیح کی طرح امام بخاریؒ سے قطعاً ثابت نہیں ہیں اور ساتھ ساتھ ان روایات کی اندرونی علتوں کو جاننے کے لئے ان اسانید کی چھان بین ہی واحد راستہ ہے؛ چنانچہ جب آپ یہ دیکھیں کہ بخاریؒ نعیم بن حمادؒ سے کوئی واقعہ روایت کر رہے ہیں، تو فوراً نعیمؒ کے بارے میں حافظ دولابیؒ اور ابوالفتح ازدیؒ کا تبصرہ ذہن میں ضرور رکھیں اور جب آپ یہ دیکھیں کہ بخاریؒ حمیدیؒ (۳) سے کچھ نقل کر رہے ہیں، تو ان کے بارے میں محمد بن عبدالحکمؒ کا تبصرہ ذہن میں ضرور رکھیں اور اسی طرح سے

(۱) امام کوثری نور اللہ مرقدہ نے احناف کے خلاف ابن عدیؒ کی ظالمانہ جرحوں اور متعصّبانہ حملوں کا دفاع کرنے کے لئے ''ابداء وجوہ التعدی فی کامل ابن عدی'' کے نام سے ایک لطیف رسالہ بھی تصنیف فرمایا تھا؛ لیکن یہ رسالہ اب تک مطبوع نہیں ہے، شیخ ابوغدہؒ، استاذ احمد خیری اور دیگر حضرات کا کہنا ہے کہ یہ رسالہ مخطوطہ کی شکل میں ہے۔

(۲) علامہ کوثریؒ استاذ حسام الدین قدسیؒ کی کتاب ''انتقاد المغنی'' کے مقدمہ میں فرماتے ہیں: عقیلیؒ جرح کرنے میں انتہائی متشدد لوگوں میں تھا، احادیث پر نفی کا حکم کثرت سے لگایا کرتا تھا اور اسی وجہ سے ذہبیؒ عقیلیؒ پر اپنی کتاب ''میزان الاعتدال'' میں ایک جگہ سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھتے ہیں: حالاں کہ ذہبیؒ حنبلی محدثین کا شدت سے دفاع کرتے ہیں، عقیلی! کیا تو عقل سے محروم ہے؟ کیا تجھے معلوم ہے کہ تو کس شخصیت کے بارے میں کلام کر رہا ہے؟ شاید تجھے یہ نہیں معلوم کہ ان میں سے ہر ایک تجھ سے بدرجہا ثقہ ہے اور بلکہ بہت سے ایسے ثقہ راویوں سے بھی زیادہ ثقہ ہے، جنھیں تو نے اپنی کتاب میں ذکر نہیں کیا ہے۔

علامہ کوثریؒ نے عقیلیؒ کی متصبانہ جرحوں کا جواب دینے کے لئے باضابطہ ایک رسالہ تصنیف فرمایا تھا؛ لیکن شاید یہ رسالہ امام کوثریؒ کی مفقودہ کتابوں کے زمرہ میں ہے؛ کیوں کہ اس رسالہ کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملتا، بعض حضرات نے اس رسالہ کو امام کوثریؒ کی مخطوطہ کتابوں کے زمرہ میں بتایا ہے، واللہ اعلم۔

(۳) امام کوثریؒ ''تانیب الخطیب'' ص: ۳۶ پر فرماتے ہیں کہ حمیدیؒ نہایت متعصب تھے اور علماء کی شان میں گستاخی کرتے تھے۔

جب آپ یہ دیکھیں کہ بخاریؒ اسماعیل بن عرعرہؒ سے کچھ روایت کر رہے ہیں تو کتبِ جرح وتعدیل میں اس شخص کے بارے میں چھان بین کریں اور ساتھ ساتھ اس بات کو نہ بھولیں کہ حمیدیؒ اور اسماعیلؒ (۱) کی روایتوں میں انقطاع ہے، اسی طرح سے آپ کے لئے دیگر کتابوں کے بارے میں بھی محتاط رہنا ضروری ہے۔

جرح وتعدیل میں ابن حبانؒ کی بے اعتدالی

رہا مسئلہ جرح وتعدیل کے موضوع پر ابن حبانؒ کی کتابوں کا، تو آپ علامہ یاقوت حمویؒ کی کتاب ''معجم البلدان'' میں بست کے مادہ میں ان کے احوال ملاحظہ فرما سکتے ہیں، امام ذہبیؒ نے اپنی کتاب ''میزان الاعتدال'' میں ایوب بن عبدالسلامؒ کے ترجمہ میں ابن حبانؒ کے بارے میں لکھا ہے: ''یہ (ابن حبان) تنقید کرنے اور لوگوں کے بارے میں بکواس کرنے میں ماہر ہے''۔(۲)

ابن المدینیؒ اور عبدالرحمٰن بن مہدیؒ

اسی طرح سے ابن الجوزیؒ نے اپنی کتاب ''مناقب الامام احمدؒ'' میں ابن المدینیؒ کے بارے میں جو ریمارک کیا ہے، اسے بالکل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، رہا مسئلہ عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کا، تو موصوف خوب طعن وتشنیع کیا کرتے تھے اور کثرت سے اپنی آراء سے رُجوع بھی فرمایا کرتے تھے، ابوطالب مکیؒ نے ''قوت القلوب'' (۳) میں فرمایا ہے: ''ابن مہدیؒ کبھی کبھی حدیث کا انکار کر دیا کرتے تھے، اس کے بعد پھر اسی حدیث کو صحیح قرار دیتے تھے اور وہ کہتے کہ اب انھیں یہ حدیث مل چکی ہے''، ابن مہدیؒ کے بھانجے سے مروی ہے کہ: ''میرے ماموں نے بہت سی احادیث پر غلط کا نشان لگا دیا تھا اور پھر ان کے بعد ان پر صحیح کا نشان لگا دیا'' ایک بار میں نے یہی احادیث

---

(۱) امام کوثریؒ ''تانیب الخطیب''، ص: ۸۴ پر فرماتے ہیں کہ اسماعیل بن عرعرہؒ مجہول الصفت ہے اور تواریخ وتراجم کی کسی بھی کتاب میں مجھے اس کا ذکر نہیں مل سکا یہاں تک کہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب ''التاریخ الکبیر'' میں بھی اس شخص کا ذکر نہیں فرمایا ہے؛ حالاں کہ بخاریؒ نے خود اس منقطع واقعہ کو اسی راوی سے نقل کیا ہے۔

(۲) ابن حبانؒ کی جرح اور تعدیل سے متعلق مزید تفصیل کے لئے علامہ عبدالحئی لکھنویؒ کی کتاب ''الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل''، ص: ۲۷۵ اور علامہ ظفر احمد عثمانی تھانویؒ کی ''قواعد فی علوم الحدیث''، ص: ۴۰۹، ملاحظہ فرمائیں اور ساتھ ساتھ محدث جلیل شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کی تعلیقات ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) ابوطالب مکیؒ کی اصل عربی عبارت ''قوت القلوب''، ج: ۱/۱۰۳ سے ملاحظہ فرمائیں:

''عن ابن اخت عبد الرحمٰن بن مهدی قال : كان خالی قد خط علی احادیث ثم صح علیها بعد ذٰلک وقرأتها علیه فقلت : قد كنت خططت علیها ؟ قال : نعم ، ثم تفكرت ، فأذا إنی إن ضعفتها اسقطت عدالة ناقلیها ، فان جاءنی بین یدی الله تعالیٰ وقال : لم اسقطت عدالتی ، رأیتنی لم یكن لی حجة''۔

آپ کے سامنے پڑھیں اور میں نے کہا: ''آپ نے تو ان احادیث پر غلط کا نشان لگا دیا تھا؟'' اس پر آپ نے کہا: ''جی ہاں، لگا دیا تھا؛ لیکن اس کے بعد میں نے سوچا کہ اگر میں نے ان احادیث کی تضعیف کر دی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ان احادیث کے ناقلین کی عدالت کو ساقط کر رہا ہوں، اگر یہ لوگ قیامت کے دن اللہ کے سامنے میرے پاس آ کر سوال کرنے لگے: میری عدالت کو تم نے کیوں ساقط کیا؟ تو یقیناً میرے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی''
ابن مہدیؒ کے بارے میں امام عجلیؒ کا تبصرہ ان کے بیٹے کے سوالات میں ملاحظہ فرمائیں۔

جرح وتعدیل میں خطیب بغدادیؒ کا وزن

رہا مسئلہ خطیب بغدادیؒ کا تو آپ اس شخص کے ان اشعار کو ضرور پڑھیں، جسے خود اسی کی تحریر سے ابن الجوزیؒ نے ''**السھم المصیب فی الرد علی الخطیب**'' میں نقل کیا ہے، (۱) ساتھ ساتھ سبط ابن الجوزیؒ نے

---

(۱) حافظ زیلعیؒ نے خطیب بغدادیؒ کے بارے میں ابن الجوزیؒ کا تبصرہ اپنی کتاب ''نصب الرایہ فی تخریج احادیث الھدایہ'' ج:۲/۶ ۱۳ پر نقل کیا ہے، ابن الجوزیؒ فرماتے ہیں:

'' وقد أورد الخطيب فى ''كتابه '' الذى صنفه فى القنوت احاديث ، اظهر فيها تعصبه ، فمنها : ما أخرجه عن دينار بن عبد الله ، خادم انس بن مالک ، عن انس ، قال : ما زال رسول الله صلى الله عليه وسلم يقنت فى صلاة الصبح حتى مات ، انتهى قال : وسكوته عن القدح فى هذا الحديث ، واحتجاجه به ، وقاحة عظيمة ، وعصبية باردة ، وقلة دين ، لانه يعلم أنه باطل ، قال ابن حبان : دينار يروى عن انس آثاراً موضوعة ، لا يحل ذكرها فى الكتب ، الا على سبيل القدح فيه ، فواعجبا للخطيب ، اما سمع فى الصحيح : ''من حدث عنى حديثا ، وهو يرى انه كذب ، فهو احد الكاذبين''؟ وهل مثله إلا كمثل من أنفق نبهرجا ودلسه ؟ فإن أكثر الناس لا يعرفون الصحيح من السقيم ، و إنما يظهر ذٰلک للنقاد ، فإذا اورد الحديث محدث ، واحتج به حافظ لم يقع فى النفوس الا أنه صحيح ، ولكن عصبيته ، ومن نظر ''كتابه'' الذى صنفه فى القنوت ، و''كتابه'' الذى صنفه فى الجهر ، ومسألة الغيم ، واحتجاجه بالأحايث التى يعلم بطلانها ، اطلع على فرط عصبيته ، وقلة دينه''۔

''یعنی خطیبؒ نے قنوت کے موضوع پر لکھی گئی اپنی کتاب میں ایسی احادیث ذکر کی ہیں، جس سے ان کے تعصب کا پتہ ملتا ہے، اسی طرح کی ایک وہ حدیث ہے، جسے خطیبؒ نے انس بن مالکؓ کے خادم دینار بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز میں وفات تک قنوت کرتے رہے، ابن الجوزیؒ فرماتے ہیں کہ خطیبؒ کا اس حدیث کی تضعیف نہ کرنا اور اس سے استدلال کرنا بڑی گستاخی، بھونڈے تعصب اور قلتِ دین کی علامت ہے؛ کیوں کہ خطیبؒ کو یہ بات اچھی طرح سے معلوم ہے کہ یہ حدیث باطل ہے، ابن حبانؒ نے کہا ہے کہ دینار انس بن مالکؓ سے موضوع روایات نقل کرتا ہے، جن کا ذکر کتابوں میں کرنا جائز نہیں ہے، ←

بھی جو کچھ ''مرآۃ الزمان فی تواریخ الأعیان'' میں اس شخص کے بارے میں لکھا ہے، اس کا بھی مطالعہ کریں؛ تا کہ جرح وتعدیل میں اس شخص کے کلام کا کیا وزن ہوسکتا ہے، اس کا صحیح اندازہ لگا سکیں۔

ابن ابی حاتمؒ کی کتاب الجرح والتعدیل

رہا مسئلہ ابن ابی حاتمؒ کی ''کتاب الجرح والتعدیل'' کا تو آپ اُمت محمدیہ کے سب سے بڑے حافظ حدیث امام بخاریؒ کے بارے میں جب موصوف کا کلام ''ابوزرعہ اور ابوحاتم نے ان کو یعنی بخاری کو متروک قرار دیا ہے'' دیکھیں گے تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ موصوف کے اندر کتنی دھاندلی بازی تھی؛ چنانچہ ابن ابی حاتمؒ کی کتاب میں جو بھی جرح آپ دیکھیں، اس کے بارے میں اچھی طرح سے چھان پھٹک کرلیا کریں ''شروط الأئمۃ'' کے آغاز میں میں نے اس سلسلہ میں امام رامہرمزیؒ سے کچھ فوائد اپنی تعلیقات میں ذکر کیا ہے، امام ابن معینؒ فرماتے ہیں: ''کبھی کبھی ہم ایسے شخص کے بارے میں بھی جرح کر دیتے ہیں جو بہت پہلے سے جنت الفردوس میں اپنی منزل پا چکا ہوتا ہے''۔

ابراہیم بن بشار رمادی نے ابن عیینہؒ کی زبانی کتنی روایتیں وضع کی ہیں، اس کا اندازہ تک نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح سے یاروں نے اس سلسلہ میں امام مالکؒ کی جانب بہت سی جھوٹی روایات منسوب کر رکھی ہیں، جیسا کہ امام ابوالید باجیؒ کی کتاب ''المنتقی شرح المؤطا'' سے ظاہر ہوتا ہے۔

ساجیؒ کا تعصب

ابوالحسن ابن القطانؒ وغیرہ نے ساجیؒ کے بارے میں کہا ہے: ''یہ شخص روایت حدیث میں مختلف فیہ ہے، ایک جماعت نے اس شخص کی تضعیف کررکھی ہے، جب کہ کچھ دوسرے لوگوں نے ان کی توثیق بھی کی ہے'' اسی وجہ سے آپ ساجیؒ کے بارے میں یہ دیکھیں گے کہ اس کے پاس بہت سے مجہول قسم کے راویوں سے منکر روایات کی

← مگر اس وقت جب کہ تضعیف مقصود ہو، تعجب ہوتا ہے خطیبؒ پر، کیا اس نے وہ صحیح حدیث نہیں سنی جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مجھ سے کوئی حدیث بیان کرتا ہے؛ حالاں کہ وہ جانتا ہے کہ یہ جھوٹی ہے، تو وہ خود بھی ایک جھوٹا ہی مانا جائے گا، ایسا شخص اس شخص کی طرح ہے جو دھوکے سے نقلی کرنسی یا کھوٹے سکے کو رائج کرنے کی کوشش کرتا ہے، اکثر لوگ صحیح اور ضعیف کا علم نہیں رکھتے ہیں، اس کا علم صرف ناقدین ہی کو ہوتا ہے؛ لہٰذا جب کوئی بھی محدث حدیث بیان کرتا ہے اور اس سے استدلال کرتا ہے تو لوگوں کو یہ تاثر ملتا ہے کہ حدیث صحیح ہے؛ لیکن کیا کیا جائے تعصب کا؟ جو شخص بھی خطیبؒ کی قنوت کے موضوع پر لکھی گئی کتاب اور اسی طرح سے جہر اور غیم کے مسئلوں پر لکھی گئی تصانیف پر نظر ڈالے گا اور یہ دیکھے گا کہ کس طرح خطیبؒ ان احادیث کے بطلان کا علم ہونے کے باوجود اس سے استدلال کرتے ہیں تو اسے خطیبؒ کے شدت تعصب اور قلتِ دین کا علم ہوگا''۔

ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہے، خطیب بغدادیؒ کی تاریخ میں ساجیؒ سے منکر روایت کی بھر مار ہے، امام ابوبکر رازیؒ حنفی نے حدیث ذکاۃ الجنین ...... کے تحت ساجی کے ایک تفرد کا ذکر کرتے ہوئے تبصرہ فرمایا ہے کہ: ''یہ شخص نہ تو مامون ہے اور نہ ہی ثقہ'' اسی وجہ سے اس کی کتاب ''علل الحدیث'' اور ''اختلاف الفقہاء'' میں اس کے کلام کو قطعاً مستند قرار نہیں دیا جاسکتا ہے، اس شخص کے اندر اتنا تعصب پایا جاتا تھا، جو بیان سے باہر ہے۔

احناف پر اعتراض کرنے والا جہالت یا جمود کا شکار

ہمارے ائمۂ احناف پر اعتراض کرنے والا یا تو جمود کا شکار راویِ حدیث ہوتا ہے، جو ہمارے ائمۂ فقہ کے علمی مدارک کی باریکیوں اور فقہی مراتب کی بلندی تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے، جس کی وجہ سے وہ ان پر علماء پر مخالفت حدیث کا الزام لگا دیتا ہے؛ حالاں کہ ایسا شخص خود مخالف حدیث ہوتا ہے نہ کہ ہمارے علماء، اور یا تو ہمارے علماء پر تنقید کرنے والا ایسا شخص ہوتا ہے، جو فکری انحراف کا شکار ہوتا ہے اور اعتقادی بدعات میں ملوث ہوتا ہے، ہمارے علماء کے بارے میں ایسا شخص یہ تصور کرتا ہے کہ یہ لوگ اعتقادی اُمور میں راہِ حق سے ہٹے ہوئے تھے؛ حالاں کہ خود یہ کمبخت گمراہی کے دلدل میں پھنسا ہوا ہوتا ہے، بعض طعن وتشنیع کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس سے بھی اس کا صدور ہوا ہو، وہ پہلی ہی نظر میں انسانی مقام سے نیچے گر جائے گا؛ چنانچہ مثلاً اگر آپ کسی کو یہ کہتے ہوئے سنیں کہ: ''فلاں شخص سے زیادہ منحوس اسلام میں کوئی پیدا نہیں ہوا'' تو سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں کوئی نحوست ہے ہی نہیں اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حدیث میں مذکورہ تین چیزوں کے علاوہ اور چیزوں میں بھی نحوست ہے، تو پھر اس کلام پر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ نحوست ایک نسبتی چیز ہے اور اسی لئے کسی خاص شخص کو نبی معصوم کی جانب سے وارد نص کے بغیر سب سے بڑا منحوس قرار دینا ایک حکم غیبی کے مساوی ہوگا، جس سے اہل دین کا بچنا ضروری ہے؛ لہٰذا اگر ایسا کلام کسی شخص سے صادر ہوتا ہے، تو سب سے پہلے خود یہ جارح مجروح شخص سے پہلے لوگوں کی نظروں سے گر جائے گا، بڑا بدنصیب ہے وہ شخص جو اُمت کے قائدین کی شان میں اس طرح کا مذاق ہمیشہ ہمیش کے لئے اپنی کتابوں کا حصہ بنا دے۔(۱)

---

(۱) امام کوثریؒ اس پیراگراف میں امام بخاریؒ کی کتاب ''التاریخ الصغیر'' ص: ۱۷۴ میں مذکور ایک روایت کی جانب اشارہ فرماتے ہوئے اس کی پرزور تردید فرما رہے ہیں ''التاریخ الصغیر'' کی اس روایت میں سفیان ثوریؒ کی جانب یہ منسوب کیا گیا ہے کہ جب سفیان ثوریؒ کے پاس امام ابوحنیفہؒ کی وفات کی خبر پہنچی تو انھوں نے ردعمل ظاہر کرتے ہوئے فرمایا: الحمد للہ، یہ شخص یعنی ابوحنیفہؒ تو اسلام کی دھجیاں اُڑا رہا تھا، اسلام میں اس سے زیادہ منحوس کوئی بھی شخص نہیں پیدا ہوا۔

علامہ کوثریؒ نے امام بخاریؒ کی اس روایت پر کئی اعتراضات کئے ہیں، پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس کی سند میں نعیم بن حمادؒ ہے، جسے متعدد ائمہ جرح وتعدیل نے متہم اور وضاع وکذاب تک قرار دیا ہے، جس کی وجہ سے یہ واقعہ موضوع قرار پائے گا اور اسے رد کر دیا ←

علاقائیت، قومیت اور مذہبیت کی بنیاد پر جرح وتعدیل

کسی شخص پر اس وجہ سے جرح کرنا کہ وہ جارح کے علاقے سے تعلق نہیں رکھتا ہے، یا اس کی قوم کا نہیں ہے، یا اس کے مذہب سے اس کا تعلق نہیں، یہ محض تعصب کے اور کچھ نہیں، جس سے اہل علم کو ہر حال میں اجتناب کرنا چاہئے، امام شافعیؒ اپنی کتاب ''الأم'' میں فرماتے ہیں: ''جو شخص کسی سے اس وجہ سے نفرت کرتا ہے؛ کیوں کہ وہ کسی اجنبی جگہ سے تعلق رکھتا ہے، تو ایسے شخص کو متعصب اور مردود الشہادۃ قرار دیا جائے گا'' امام ابو طالب مکیؒ ''قوت القلوب''(۱) میں تحریر فرماتے ہیں :

> بعض حفاظِ حدیث بے جا جرأت اور گستاخی کی زد میں آجاتے ہیں اور جرح کرتے وقت حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور الفاظ کے مناسب دائرہ سے باہر نکل جاتے ہیں؛ حالاں کہ جس پر وہ جرح کرتے ہیں، وہ خود ان سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے اور اللہ رب العزت کے یہاں اسے عظیم تر رتبہ حاصل ہوتا ہے، اس جذبہ سے کی گئی جرح خود جارح پر لوٹ آتی ہے۔

ابن قتیبہؒ کی کتاب ''**الاختلاف فی اللفظ والرد علی الجہمیۃ والمشبھۃ**'' میں کچھ ایسے اشارات ملتے ہیں جس سے امام احمد بن حنبلؒ کی آزمائش کے بعد جرح وتعدیل کے نام پر محدثین کی دھاندلی بازیوں کا پردہ فاش ہوجاتا ہے۔(۲)

← جائے گا، امام کوثریؒ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس روایت میں جو یہ بتایا گیا ہے کہ ابوحنیفہؒ سب سے زیادہ منحوس ہیں، اس طرح کی بات جاننے کے لئے نص کی ضرورت ہے، بغیر وحی کے کسی بھی فرد کو سب سے زیادہ منحوس قرار دینا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ نحوست ایک نسبی چیز ہے جو کم وبیش ہوسکتی ہے؛ لہٰذا بالتعیین کسی کو سب سے زیادہ منحوس قرار دینا قابل قبول نہیں ہے، امام کوثریؒ فرماتے ہیں کہ چوں کہ وحی بند ہوچکی ہے، جس کے ذریعہ اس طرح کا حکم صادر کیا جاسکے تو اب اس طرح کا ظالمانہ تبصرہ صرف شیطانی وحی ہی کا حصہ ہوسکتا ہے، امام کوثریؒ کا تیسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ امام بخاریؒ جیسے جبال علم اور اکابر محدثین کے لئے یہ بات زیب نہیں دیتی کہ اس طرح کی مخدوش اور معلول روایتیں اپنی کتابوں میں ذکر کریں؛ چنانچہ اس روایت کو اپنی کتاب میں ذکر کرنے سے پہلے امام بخاریؒ کو اس کے کمزور پہلوؤں اور منفی نتائج پر اچھی طرح سے غور کرلینا چاہئے تھا۔

(۱) ابو طالب مکیؒ کی اصل عربی عبارت ''قوت القلوب'' ج: ۱/۳۰۰ سے ملاحظہ فرمائیں: ''**وقد یتکلم بعض الحفاظ بالإقدام والجراءۃ فیجاوز الحد فی الجرح ویتعدی فی اللفظ ویکون المتکلم فیہ أفضل منہ، وعند العلماء باللہ تعالیٰ: أعلی درجۃ فیعود الجرح علی الجارح**''۔

(۲) امام کوثریؒ یہاں امام احمدؒ کے دور میں رونما ہونے والے اس خوفناک فتنہ کی جانب اشارہ فرمارہے ہیں جسے تاریخ میں فتنۂ خلق قرآن کے نام سے جانا جاتا ہے، اس فتنہ میں بہت سے علماء خاص طور پر محدثین کو شدید ترین سزائیں دی گئیں اور ہولناک آزمائشوں سے ←

محدثین کی متعصّبانہ جرح کے بارے میں ابن الجوزیؒ کا قیمتی تبصرہ

ابن الجوزیؒ اپنی معروف کتاب ''تلبیس ابلیس'' میں فرماتے ہیں :

> محدثین کو ابلیس اپنی تلبیس کے جال میں اس طرح سے پھانستا ہے کہ ان سے ایک دوسرے پر جرح کرواتا ہے، جس سے یہ حضرات ذاتی انتقام لیتے ہیں اور اسے یہ لوگوں کے سامنے جرح وتعدیل کی صورت میں پیش کرتے ہیں، جب کہ اس اُمت کے علماء سلف نے اس فن کو شریعت محمدیہ کی دفاع کے لئے استعمال کیا تھا، اللہ تعالیٰ ہی لوگوں کے ارادوں کو اچھی طرح جانتا ہے، ان لوگوں کے بدنیتی کی دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ جس سے روایت نقل کرتے ہیں، اس کے بارے میں خاموش رہتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سابق الذکر انداز کی جرح وتعدیل کی کتابیں اور ''تاریخ ابن ابی خیثمۃ'' اور کرابیسیؒ کی ''کتاب المدلسین'' (۱) وغیرہ نے کسی بھی ایسے شخص کو نہیں چھوڑا جس پر جرح نہ کردی ہو، چاہے وہ حفاظِ حدیث میں سے

← گذرنا پڑا اور بہت سے لوگ تہہِ تیغ ہوگئے، اس فتنہ کی اصل بنیاد یہ تھی کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق، جانبین سے افراط وتفریط اس قدر بڑھی کہ ہر گروہ نے دوسرے کو صراط مستقیم سے منحرف بتایا؛ چوں کہ اس اختلاف میں شامل محدثین کی مخالفت کرنے والے معتزلہ اور تاویل کرنے والے حضرات کی بڑی جماعت اس دور میں احناف کے گروہ سے تعلق رکھتی تھی؛ اس لئے محدثین نے خاص طور پر احناف کو اپنی جرح وتنقید کا نشانہ بنایا، جرح وتعدیل کے نام پر محدثین کی ایک جماعت نے فقہاء کو مطعون کرنا شروع کردیا، معتزلہ سے انتقام لینے کے لئے بعض محدثین نے معتزلہ کے فقہی امام اور پیشوا ابوحنیفہؒ کو بھی نہیں بخشا، محدثین کی ایک بڑی جماعت احناف کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی اور ان حضرات نے جرح وتعدیل کے موضوع پر لکھی گئی اپنی کتابوں میں زیادہ تر احناف کو ناروا طعن وتشنیع اور تنقید وتجریح کا ہدف بنانا شروع کردیا اور یہیں سے اہل الرائے کے مکتبِ فکر سے تعلق رکھنا خود ایک جرح بن گیا۔

(۱) امام کرابیسیؒ کی اس کتاب کی وجہ سے بہت سے مخالفین حدیث کو دلائل ہاتھ آگئے اور یہ حضرات اسے علم حدیث اور اس سے اشتغال رکھنے والے علماء کے خلاف استعمال کرنے لگے، حافظ ابن رجب حنبلیؒ ''شرح علل الترمذی'' ج: ۲/۸۰۶-۸۰۷ میں فرماتے ہیں: ''کرابیسیؒ کی یہ کتاب امام احمدؒ کے سامنے پیش کی گئی اور آپ نے اس کی سخت مذمت کی، اسی طرح سے ابوثورؒ اور دیگر علماء نے بھی اس کتاب پر نکیر کی، مروزیؒ کہتے ہیں، میں کرابیسیؒ کے پاس اس وقت آیا، جب انھوں نے اپنے آپ کو کہیں چھپالیا تھا اور سنت کا دفاع کررہے تھے اور ابوعبداللہ احمد بن حنبلؒ کی تائید کررہے تھے، میں نے ان سے کہا کہ لوگ آپ کی ''کتاب المدلسین'' ابوعبداللہؒ کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں؛ چنانچہ آپ اس بات کا اعلان کردیں کہ آپ اپنی اس تصنیف پر نادم ہیں اور اس سلسلہ میں ابوعبداللہؒ کو باخبر کردیں، اس پر مجھ سے انھوں نے کہا، ابوعبداللہ احمد بن حنبلؒ نیک شخص ہیں اور ان کے اندر حق شناسی کی صلاحیت ہے، مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر میری کتاب ان کے سامنے پیش کردی جائے، کرابیسیؒ نے مزید کہا کہ مجھ سے ابوثورؒ، ابن عقیلؒ اور حبیشؒ نے یہ درخواست کی کہ میں ←

رہا ہو یا ائمہ فقہاء میں سے، صاحب ابن عباد نے بڑے بڑے حفاظِ حدیث اور علم حدیث سے شغف رکھنے والوں کا یہ سب سے بڑا عیب مانا ہے اور یہی نہیں بلکہ ان لوگوں کے خلاف ایک خاص تصنیف بھی رقم کی ہے، اسی طرح سے بعض فتنہ پرداز عناصر نے دیگر علماءِ دین کے خلاف نازیبا حرکتیں کی ہیں، اس مقام پر ہم اس سے زیادہ توسع اور تفصیل فراہم نہیں کرنا چاہتے۔

حافظ ابن حجرؒ کا تعصب اور حقیقت پوشی

قابل افسوس بات یہ ہے کہ یہ مردود قسم کا تعصب صدیوں سے چلا آرہا ہے اور رُکنے کا نام نہیں لے رہا ہے، مثال کے طور پر حافظ ابن حجرؒ کو لے لیجئے، موصوف اپنی کتاب ''لسان المیزان'' میں معمر بن شبیب بن شیبہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس شخص نے مامونؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ: ''میں نے شافعیؒ کا ہر چیز میں امتحان لیا اور انھیں ہر میدان میں با کمال پایا، بس ایک امتحان اور رہ گیا ہے، اگر شافعیؒ اس میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو آپ کا

← اس کتاب سے رُجوع کرلوں؛ لیکن میں نے اس سے انکار کردیا اور میں نے ان حضرات سے جواباً کہا کہ میں اس کتاب میں مزید اضافہ کرنے والا ہوں''۔

کرابیسیؒ کو اپنی اس کتاب کے بارے میں کافی اصرار رہا اور اس سے رُجوع کرنے سے انکار کردیا؛ چنانچہ اس کتاب کو ابوعبداللہؒ کے پاس لایا گیا؛ لیکن آپ کو اس کا علم نہیں تھا کہ اس کتاب کے مصنف کون ہیں، اس کتاب میں اعمشؒ پر جرح کی گئی تھی اور حسن بن صالح کی تائید، اس کتاب میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ حسن بن صالح خوارج کا عقیدہ رکھتے تھے، تو ہم اس سے کہیں گے کہ حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ نے بھی تو خروج اختیار کیا تھا، جب یہ کتاب ابوعبداللہؒ کے سامنے پڑھی گئی، تو آپ نے تبصرہ فرمایا: ''اس شخص نے مخالفین کے لئے ایسے دلائل جمع کردیا ہے، جسے وہ خود جمع نہیں کرسکتے تھے اور نہ ہی اس سے استدلال کرسکتے تھے، اس کتاب سے دُور رہو'' امام احمدؒ نے اس کتاب سے لوگوں کو روکا۔

اس کتاب کے ذریعہ معتزلہ وغیرہ دیگر اہل بدع جیسے صاحب ابن عباد وغیرہ نے علماء حدیث پر حملہ کرنا شروع کردیا، اسی طرح سے بعض علماء حدیث کو بھی اس کتاب سے دھوکہ ہوگیا اور وہ دانستہ طور پر اس کتاب سے منفی قسم کی باتیں اعمشؒ وغیرہ کی جرح سے متعلق نقل کرنے لگے، جیسا کہ یعقوب بن سفیان فسویؒ وغیرہ نے کیا ہے۔

امام طحاویؒ نے کرابیسیؒ کی کتاب پر ایک رد لکھا تھا، جس کا ذکر متعدد سوانح نگاروں نے امام طحاویؒ کے ترجمہ میں کیا ہے، امام طحاویؒ کی یہ کتاب ''نقض کتاب المدلسین علی الکرابیسی'' اور ''الرد علی الکرابیسی'' کے عنوان سے معروف ہے، علامہ بدرالدین عینیؒ نے ''عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری'' (باب عرق الاستحاضہ) ج: ۳/ ۴۶۲ پر اور (باب مایقول بعد التکبیر) ج: ۵/ ۴۱۹ پر اور امام ابن الترکمانی ماردینیؒ نے بھی ''الجوہر النقی'' میں ج: ۱/ ۱۱، اور ۱۲۸ پر اس کتاب کا ذکر کیا ہے اور اس سے کلام نقل کیا ہے؛ لیکن غالباً یہ کتاب امام طحاویؒ کی مفقودہ کتابوں میں سے ہے، جنھیں شاید وقت کی دیمک نے چاٹ لیا، یا خونریز جنگوں کے نذر ہوگئی، اسی طرح سے امام کرابیسیؒ کی اصل کتاب کا بھی کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے۔

لوہا ماننا ہی پڑے گا اور وہ یہ ہے کہ میں انھیں نبیذ پلانا چاہتا ہوں اور اگر وہ جید العقل اور پختہ ذہن ہوں گے تو یہ نبیذ انھیں مغلوب نہ کرسکے گی'' مجھے مامونؒ کے خادم ثابت نے بتایا کہ مامونؒ نے امام شافعیؒ کو بلایا اور انھیں ایک رطل نبیذ دی، اس پر امام شافعیؒ نے جواب دیا کہ اے امیر المومنین! میں نے نبیذ کبھی بھی نہیں چکھی ہے؛ لیکن اس کے باوجود مامونؒ نے انھیں ایسا کرنے کے لئے مجبور کیا اور اس کے بعد امام شافعیؒ اسے پی گئے، اور اس کے بعد لگا تار امام شافعیؒ نے بیس رطل نبیذ چڑھالی اور پھر بھی آپ کی عقل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور نہ ہی آپ حواس باختہ ہوئے، حافظ ابن حجرؒ اس واقعہ کا تعقب کرتے ہوئے تبصرہ فرماتے ہیں: ''جو شخص بھی تاریخ کی معمولی معلومات رکھتا ہے، وہ اس بات کا آسانی سے پتہ لگا سکتا ہے کہ یہ واقعہ جھوٹا ہے''۔

لیکن اسی حافظ ابن حجرؒ کو آپ ''توالی التانیس'' ص: ۵۶ میں دیکھیں تو سہی کہ کس طرح سے اس واقعہ کو نقل کرتے ہیں، آپ فرماتے ہیں کہ معمر بن شبیب کا کہنا ہے کہ میں نے مامون کو یہ کہتے ہوئے سنا: ''کہ میں محمد بن ادریس شافعیؒ کا ہر چیز میں امتحان لے چکا ہوں اور مجھے یہ شخص ہر میدان میں باکمال لگا'' ابن حجرؒ نے واقعہ کے صرف اسی جز پر اکتفا کیا ہے؛ حالاں کہ پورا واقعہ مکذوب ہے، آخر کس طرح سے حافظ ابن حجرؒ نے امام شافعیؒ کی کسی منقبت کے اثبات کے لئے کسی واقعہ کے ایک جزو سے استدلال کو روا سمجھ لیا، اُصولاً جو چیز ایک ہی سند سے مروی ہے یا تو اسے پورے طور پر رد کردینا چاہئے یا تو پورے طور پر قبول کرنا چاہئے، حافظ ابن حجرؒ نے جس عصبیت کا یہاں ارتکاب کیا ہے، اسی کو بعینہٖ خیانت کہا جاتا ہے، ''**الدرر الكامنة في أعيان المائة الثامنة**'' میں کتنے حنفیہ وغیرہ کے خلاف بھونڈے قسم کے تعصّبات کا خود حافظ ابن حجرؒ کے تلمیذ ارشد نے ذکر کیا ہے، اس کتاب پر امام سخاویؒ کے حواشی ملاحظہ فرمائیں، حافظ ابن حجرؒ سے اس قبیل کی اتنی بے اعتدالیاں ہیں جن کو یہاں اس سے زیادہ تفصیل سے نہیں بیان کیا جاسکتا۔

اسی قبیل سے حافظ ابن حجرؒ کا ''**توالی التأنيس بمعالی ابن إدريس**'' (۱) میں یہ قول بھی ہے:
قدماء میں اس کے مشہور ہونے کی دلیل وہ روایت ہے، جسے بیہقیؒ نے احمد بن عبدالرحمٰن کے طریق سے روایت کیا ہے۔

---

(۱) اس کتاب کا صحیح نام ''توالی التأنيس بمعالی ابن إدريس'' ہے؛ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ کتاب ۱۳۰۱ھ میں بولاق سے ''توالی التأسيس لمعالی ابن إدريس'' کے عنوان سے شائع کی گئی، اس کے بعد یہ کتاب ۱۴۰۶ھ میں دار الکتب العلمیہ سے بھی اسی غلط عنوان کے ساتھ ابوالفداء عبداللہ القاضیؒ کی تحقیق سے شائع کی گئی، جہاں ایک طرف بولاق کے نسخہ میں اغلاط وتحریفات کی کثرت تھی، تو دوسری طرف دار الکتب العلمیہ کا ایڈیشن علمی اخطاء وتحریفات میں اس سے بمراحل آگے بڑھا ہوا ہے، مزید محقق نے اس ایڈیشن میں مصنف کی اصل ترتیب کو بھی بلاوجہ بدل دیا ہے۔

حرم مکی کے مکتبہ میں محفوظ اس کتاب کے مخطوطہ کے غلاف پر بھی ''توالی التأنيس بمعالی ابن إدريس'' صاف صاف ←

ابن حجرؒ کو یہ بات اچھی طرح سے معلوم ہے کہ یہ احمد بن عبد الرحمٰن وہی ہے جو ابن الجارودرقی کے نام سے جانا جاتا ہے اور یہ مشہور قسم کا کذاب ہے، امام بیہقی کا اس شخص کے طریق سے روایت کرنا ابن حجرؒ کے لئے کوئی عذر نہیں ہے؛ کیوں کہ انھیں اچھی طرح سے معلوم ہے کہ بیہقیؒ، امام شافعیؒ کے متعلق عبد اللہ بن محمد بلوی سے موسیٰ بن نجار کے طریق سے معروف جھوٹے سفر کی روایت کرنے سے بالکل گریز نہیں کرتے؛ حالاں کہ اس کا بطلان اور کذب ظاہر ہے، ابونعیم اصفہانیؒ نے بھی یہی حرکت کی ہے؛ حالاں کہ ان دونوں کو یہ بات معلوم ہے کہ بلوی اور نجار دونوں ہی کذاب ہیں، بُرا ہو تعصب کا، واقعی یہ خصلت متعصبین کو ہلاکت میں دھکیل دیتی ہے۔(۱)

← لکھا ہوا ہے، اس مخطوطہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انتہائی قدیم نسخہ ہے اور اس کی کتابت امام ابوالخیر عبد العزیز بن فہد ہاشمی مکی شافعیؒ متوفی: ۸۹۵ھ کے ذریعہ عمل میں آئی، امام ابوالخیر بن فہدؒ کا شمار کبارِ ائمہ میں ہوتا ہے، امام سخاویؒ نے آپ کے بارے میں یہاں تک لکھا ہے کہ بلادِ حجاز میں آپ کے والد کے بعد فن حدیث میں آپ کا ہم رتبہ کوئی بھی نہ تھا۔

اسی طرح حافظ ابن حجرؒ کی حیات اور مصنفات کے بارے میں سب سے بڑی اتھارٹی حافظ سخاویؒ نے اپنی کتاب ''الجواہر والدرر فی ترجمۃ شیخ الاسلام ابن حجر'' میں بھی اس کتاب کا نام ''توالی التأنیس بمعالی ابن إدریس'' بتایا ہے، اس کے علاوہ جمال الدین ابوالمحاسن تغری بردیؒ متوفی: ۸۷۴ھ نے ''المنهل الصافی والمستوفی بعد الوافی'' میں اور حافظ جلال الدین سیوطیؒ متوفی: ۹۱۱ھ نے ''نظم العقیان فی اعیان الأعیان'' ص: ۴۷ میں اور حاجی خلیفہؒ نے ''کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون'' ج:۱/ ۵۰۳ میں اور اسی طرح سے محمد بن سلیمان رودانیؒ نے ''صلۃ الخلف بموصول السلف'' ص: ۳۹۰ میں بھی اس کتاب کا نام ''توالی التأنیس بمعالی ابن إدریس'' بتایا ہے، ان تمام دلائل سے پتہ چلتا ہے کہ بولاق اور دار الکتب العلمیہ کے ذریعہ مطبوعہ نسخوں پر کتاب کا نام ''توالی التأنیس بمعالی ابن إدریس'' غلطی سے شائع کر دیا گیا ہے، یہ تمام تفاصیل ڈاکٹر موفق بن عبد اللہ بن عبد القادرؒ کی کتاب ''توثیق النصوص وضبطها عند المحدثین'' ص: ۱۰۸-۱۱۳ سے ملخصاً معمولی تصرف کے ساتھ ماخوذ ہیں، یہ کتاب ۱۴۲۹ھ میں صحیح عنوان کے ساتھ عبد اللہ بن محمد کندری کی تحقیق کے ساتھ دار ابن حزم کے ذریعہ شائع کی گئی۔

---

(۱) شیخ ابوغدہؒ اپنے حاشیہ میں فرماتے ہیں کہ امام کوثریؒ نے اپنی متعدد کتابوں میں اس واقعہ اور اس سے ملتے جلتے ایک دوسرے واقعہ کی تردید کی ہے، اور دونوں مشہور کذاب راوی ابن النجار اور بلوی کی شخصیت سے پردہ اُٹھایا ہے، اسی طرح سے امام کوثریؒ نے آبریؒ، حافظ ابونعیمؒ اور امام بیہقیؒ پر بھی تنقید کی ہے، جنھوں نے باوجود علم کے اس واقعہ کو اپنی کتابوں میں نقل کر کے سکوت اختیار فرمایا ہے، امام کوثریؒ نے اس بات کی جانب بھی تنبیہ فرمائی ہے کہ امام الحرمین الجوینیؒ، غزالیؒ اور رازیؒ کو اس واقعہ سے اس لئے دھوکہ ہوا کیوں کہ یہ حضرات منقولات اور نقدِ رجال کے میدان میں تہی دست تھے، اسی طرح سے امام کوثریؒ نے امام نوویؒ پر بھی تنقید کی ہے؛ کیوں کہ موصوف نے بھی اپنی کتاب ''المجموع'' میں اس واقعہ کو مستند تسلیم کیا ہے اور اس واقعہ کے مصدر کو ایک مشہور اور مسموع تصنیف گردانا ہے اور اسی طرح سے امام نوویؒ نے ''تہذیب الاسماء واللغات'' میں یہ لکھا ہے کہ ابو یوسفؒ نے شافعیؒ کے پاس کسی کو بھیجا جب کہ شافعیؒ کی ملاقات ابو یوسفؒ سے قطعاً نہیں ہوئی، اس خیالی سفر اور اس سے ملتے جلتے دوسرے واقعہ میں اور بھی من گھڑت خرافات ←

امام ذہبیؒ ''میزان الاعتدال'' میں اسی نجار کے بارے میں فرماتے ہیں: یہ انسان نہیں؛ بلکہ ایک وحشی قسم کا حیوان ہے، محمد بن سہل اموی از عبداللہ بن محمد بلوی کے طریق سے امام شافعیؒ سے متعلق ایک امتحان کا ذکر کیا جاتا ہے، اگر غور کیا جائے تو یہ واقعہ ناقل کے لئے انتہائی رسوا کن ہے، اس خیالی سفر کی تکذیب خود حافظ ابن حجرؒ نے مناقب الشافعی: ۷۱ میں بھی کی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ کی ایک قابل مواخذہ حرکت یہ ہے کہ انھوں نے بلوی کو امام شافعیؒ کے شاگردوں میں شمار کرایا ہے اور اس کے بارے میں صرف ضعیف کا حکم صادر فرمایا ہے؛ حالاں کہ یہ شخص مشہور قسم کا کذاب ہے۔

جن اہم اُمور و نکات کی جانب ہم قارئین کی توجہ موڑنا چاہتے تھے، ان کے لئے یہ مباحث اُمید ہے کہ کافی وشافی ثابت ہوں گے۔

• • •

← ملتی ہیں، ان تمام واقعات کی پرزور اور مدلل تردید کے لئے امام کوثریؒ کی مندرجہ ذیل کتابیں ملاحظہ فرمائیں: احقاق الحق بابطال الباطل فی مغیث الخلق: ۱۰-۱۱، بلوغ الامانی فی سیرۃ الامام محمد بن الحسن الشیبانی: ۲۸، حسن التقاضی فی سیرۃ الامام ابی یوسف القاضی: ۵۴-۵۹، اس کے علاوہ تانیب الخطیب علی ماساقہ فی ترجمۃ ابی حنیفۃ من الاکاذیب'' میں متعدد مقامات پر اس واقعہ کی تردید موجود ہے۔

فقیہ عالم اسلام ڈاکٹر وہبہ زحیلیؒ

خالد سیف اللہ رحمانی

قرآن وحدیث میں متعدد مقامات پر شام کی فضیلت آئی ہے، سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے ارشاد: ''اَلَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَہٗ'' کی تفسیر میں بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے شام کا خطہ مراد ہے، (۱) اسی طرح: ''وَاٰوَیْنٰھُمَآ اِلٰی رَبْوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِیْنٍ'' (۲) کی تفسیر میں بھی آپ ﷺ سے منقول ہے کہ اس آیت میں جس مقام کا ذکر ہے، وہ شام ہے، جس کا ایک شہر دمشق ہے، جو شام کے شہروں میں سب سے بہتر شہر ہے، یزید بن شجرہ سے منقول ہے کہ دمشق ہی 'ربوہ مبارکہ' ہے، ایک اور روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو دمشق ہی میں قیام وسکونت کا حکم دیا تھا۔ (۳)

احادیث میں بھی شام اور دمشق کی متعدد فضیلتیں منقول ہیں، جیسے: حدیث قدسی کہ اللہ تعالیٰ نے تمام شہروں میں سے شام کو اپنے لئے خاص کیا ہے اور اللہ کے مخلص بندوں کو شام میں سکونت کی توفیق ملتی ہے، (۴) حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے لوگوں نے سوال کیا: قیامت میں لوگ کہاں جمع ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: اللہ کی بہترین اور محبوب سرزمین شام میں، (۵) اسی طرح متعدد احادیث میں قربِ قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دمشق کی جامع مسجد کے مینارہ پر آسمان سے نازل ہونے کا مضمون آیا ہے، یہ بات بھی آئی ہے کہ قرب قیامت میں مخلص مسلمان سمٹ سمٹا کر شام میں جمع ہوئیں گے۔ (۶)

شام کا ایک تاریخی شہر حلب ہے، حلب بھی دمشق ہی کی طرح ایک تاریخی شہر ہے، اور اس کی تاریخی قدامت کا سرا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جا ملتا ہے؛ چنانچہ حلب کی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب یہاں اپنی بھیڑ بکریوں کے ساتھ آتے تھے تو اطراف واکناف کے لوگ حصول برکت کے لئے آجاتے تھے

---

(۱) دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۲۱۲۔
(۲) المومنون: ۵۰۔
(۳) دیکھئے: تاریخ دمشق: ۱/ ۸۷۔
(۴) تاریخ دمشق لابن عساکر: ۱/ ۸۷۔
(۵) حوالۂ سابق۔
(۶) تاریخ دمشق: ۱/ ۹۳ تا ۱۰۲۔

اورحضرت ابراہیم علیہ السلام تبرک کے طور پر ان کی بھیڑ بکریوں کا دودھ نکال کر دیتے تھے،اسی مناسبت سے اس شہر کا نام حلب پڑ گیا،(۱) اس شہر میں اسلامی تاریخ کی ابتداء خلافت فاروقیؓ سے ہوتی ہے، جب حضرت خالد بن الولیدؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ کی سرکردگی میں یہ اسلامی قلمرو میں شامل ہوا، ولید بن عبدالملک کے زمانے میں کثرت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا، (۲) اور یہاں بڑے بڑے علماء ومشائخ پیدا ہوئے، یہاں ہزاروں صحابہ آسودۂ خواب ہیں، جن میں اعلم الحلال والحرام حضرت معاذ بن جبلؓ، امین ہذہ الامۃ حضرت ابوعبیدہؓ اور حکیم الامۃ حضرت ابودرداءؓ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

بنواُمیہ کے دمشق کو دارالحکومت بنانے کی وجہ سے یہ شہر اہل علم ونظر کا مرکز بن گیا، اکابر محدثین وفقہاء اس کی خاک سے اُٹھے یا یہیں سپرد خاک ہوئے، جن میں ایک بہت ہی نمایاں نام 'امام اوزاعی' کا ہے، جن کی فقہ پر ایک زمانے تک اُمت کے ایک بڑے گروہ کا عمل تھا، علوم اسلامیہ کی ترویج واشاعت میں ہمیشہ ہی اس شہر کا نمایاں کردار رہا ہے۔(۳)

جن اہل علم کا فیضان یہاں سے جاری ہوا، ان میں چند اہم نام یہ ہیں :

(۱) علم حدیث وفقہ میں متعدد کتابوں کے مصنف: ابراہیم بن محمد سبط ابن العجمی (م:۸۴۱ھ)۔

(۲) ممتاز حنفی فقیہ اور ملتقی الابحر کے مؤلف: ابراہیم بن محمد برہان الدین (م:۹۵۶ھ)۔

(۳) 'انسان العیون فی سیرۃ الامین والمامون' کے مصنف: علی بن ابراہیم شافعی (م:۱۰۴۴ھ)۔

(۴) حافظ حدیث: احمد بن محمد جمال الدین ابن الظاہری (م:۶۹۶ھ)۔

(۵) احمد بن عبدالحی حلبی شافعی (م:۱۱۲۰ھ)۔

(۶) معروف حنفی فقیہ احمد بن یحییٰ بن زہیر عقیلی حلبی (م:۴۲۴ھ)، جن کی تصنیف ''الخلاف بین ابی حنیفۃ واصحابہ وما انفرد بہ عنہم'' ہے۔

(۷) قرأت وتجوید کے امام: طاہر بن عبدالمنعم ابن غلبون (م:۳۹۹ھ)۔

(۸) حافظ عبدالکریم بن عبدالنور القطب الحلبی (م:۷۳۵ھ)۔

(۹) متعدد کتابوں کے مصنف حنفی فقیہ محمد بن محمد ابن الشحنہ (م:۸۱۵ھ)۔

(۱۰) شارح بخاری: محمد عمر السفیری (م:۹۵۶ھ)۔

(۱) الیواقیت والضرب فی تاریخ حلب: ۱/۱۔ (۲) نہر الذہب فی تاریخ حلب: ۳/۱۴۔

(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے: فضائل الشام والدمشق لعلی بن محمد الربعی: ۱/۱۷۔

اس خطہ میں اہل علم کا جو تسلسل رہا ہے، وہ نہایت حیرت انگیز ہے، موجودہ دور میں بھی علم حدیث کے نابغۂ روزگار عبقری علماء شیخ عبد الفتاح ابوغدہؒ، ڈاکٹر نور الدین عترؒ، شیخ محمد بن محمد عوامہ حفظہ اللہ کا تعلق یہیں سے ہے، اور انھوں نے جو بیش قیمت اور گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، وہ محتاج اظہار نہیں ہیں، اسی طرح فقہ کے میدان میں بھی علماء شام کا اور بالخصوص دمشق اور حلب کے علماء کا بڑا حصہ رہا ہے، خاص کر گذشتہ تین صدیوں سے شام میں ایسی فقہی شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں، جن کو پورے عالم اسلام میں امامت کا درجہ حاصل تھا، بارہویں ہجری میں علامہ ابن عابدین پیدا ہوئے، جن کی کتاب ''ردالمحتار'' فقہ کے ذخیرے میں ایک بے مثال کتاب ہے، آج کوئی بھی شخص موجودہ دور کے مسائل پر قلم اُٹھائے تو وہ اس کتاب سے مستغنی نہیں ہوسکتا، ابن عابدین کے ساتھ ان کے وطن کی نسبت کچھ اس طرح لگی ہوئی ہے کہ ان کی یہ کتاب ہی فتاویٰ شامیہ، یا شامی کے نام سے معروف ہوگئی، ان کی دوسری کتاب تنقیح الفتاوی الحامدیہ اور رسائل ابن عابدین وغیرہ بھی بڑی ہی بلند پایہ کتابیں ہیں، پھر تیرھویں چودھویں صدی ہجری میں شیخ مصطفیٰ زرقا کے علم وتفقہ کا سورج روشن ہوا اور پورے عالم اسلام میں ان کی عظمت کو تسلیم کیا گیا، انھوں نے خاص کر قواعد فقہ کی بحث کو ایک نئی جہت دی اور جن مسائل کا دنیا کے مروجہ قوانین میں بطور اُصول ذکر کیا جاتا ہے، جیسے: حق کا تصور، مال، عقد اور ملکیت وغیرہ کی حقیقت، ان پر اسلامی نقطۂ نظر سے ایسی بحث پیش کی کہ اس نے عصر حاضر کے فقہاء کے لئے غور وفکر کا ایک نیا دروازہ کھولا۔

اسی طرح چودہویں، پندرہویں صدی ہجری میں عالم اسلام کے سب سے بڑے فقیہ کی حیثیت سے جن کا نام اُبھرا اور جن کو ان کی گرانقدر تالیفات اور فکری اعتدال کی وجہ سے پوری دنیا میں شہرت اور پذیرائی حاصل ہوئی، وہ ڈاکٹر وہبہ مصطفیٰ زحیلیؒ ہیں، وہ فقہ اسلامی کی مملکت کے بے تاج بادشاہ تھے اور دنیا بھر میں فقہ کے موضوع پر منعقد ہونے والی کوئی بھی مجلس بجا طور پر ان کے بغیر نامکمل اور ناتمام سمجھی جاتی تھی۔

ان کا نام نامی زمانۂ طالب علمی سے سن رہا تھا اور تدریس کے ابتدائی دور ہی سے ان کی کتابوں سے استفادہ کی سعادت حاصل ہونے لگی، ان کی کتابیں دیکھ کر میرے لئے ان کی ملاقات ایک سنہرے اور خوبصورت خواب سے کم درجہ نہیں رکھتی تھی، یہ خواب اس وقت شرمندۂ تعبیر ہوا جب اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا گیارہواں سیمینار امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ میں منعقد ہوا، سیمینار کی مجلسوں کے علاوہ ان کا زیادہ وقت حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی نشست گاہ میں گذرتا تھا، ملک بھر سے آئے ہوئے چیدہ اور چنندہ علماء قاضی صاحبؒ کے پاس آتے، قاضی صاحبؒ شیخ سے ان کے کاموں اور اداروں کا تعارف کراتے اور وہ ہندوستان جیسے مسلم اقلیت ملک میں ان خدمات کو حیرت کے کانوں سے سنتے اور بار بار تحسین اور حوصلہ افزائی کے کلمات کہتے، میری کتاب ''جدید فقہی مسائل'' کا

عربی ترجمہ ہو چکا تھا، میری بہت خواہش تھی کہ شیخ اس پر پیش لفظ لکھ دیں؛ تاکہ یہ مجھ جیسے کوتاہ علم کے لئے سند ہوجائے؛ چنانچہ حضرت قاضی صاحب کے واسطہ سے میں نے ان سے گذارش کی اور انھوں نے بڑی خوشی سے نہ صرف اسے قبول فرمایا؛ بلکہ سیمینار کے درمیان ہی مسودہ دیکھ کر پیش لفظ تحریر کر کے میرے حوالہ کر دیا اور میرے بارے میں میری حیثیت سے اونچے کلمات لکھے؛ حالاں کہ مجھے اتنی جلدی اس کام کی تکمیل کی اُمید نہیں تھی۔

یہ ان سے اس حقیر کی پہلی ملاقات تھی، ان کا حلیہ بھی بڑا باوقار اور دل آویز تھا، اونچا قد، متوسط سے کچھ زیادہ جسامت، کھلا ہوا رنگ، سر پر عمامہ سے مزین ازہری ٹوپی، مسکراتا ہوا تبسم ریز چہرہ، آنکھوں سے ذہانت آشکار، ازہری علماء کے عام طریقہ کے مطابق اندر سے پینٹ شرٹ اور اوپر سے جبہ میں ملبوس، خلیق، متواضع، ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ محبت سے ملنے والے، گفتگو کچھ اس طرح کرتے کہ آنے والے کو اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا، بلا کا حافظہ، علمی استحضار ایسا کہ جس موضوع پر بولتے، ایسا لگتا کہ ابھی اس موضوع پر تازہ تازہ مطالعہ کیا ہے، دُور دُور تک بڑائی اور عہدہ ومنصب کی نخوت کا نام نہیں؛ اسی لئے جو ایک بار ملتا، بار بار ملنے کا آرزومند ہوتا۔

اس کے بعد وہ اکیڈمی کے متعدد سیمیناروں میں شرکت کرتے رہے؛ بلکہ ہم لوگ ان کو عالم عرب کا مستقل نمائندہ تصور کرتے، دوسرے علماء تو کبھی آتے، اور کبھی نہیں آتے؛ لیکن وہ پابندی سے آتے، ہر نشست میں شروع سے اخیر تک شریک رہتے، بحث میں حصہ لیتے، زیر بحث موضوع پر اپنا موقف پیش کرتے، جو تجویزیں منظور ہوتی ان کے بارے میں بھی مشورے دیتے اور تجاویز کا جب عربی ترجمہ کیا جاتا، اس میں حسبِ ضرورت لفظی ترمیم بھی کرتے، افسوس کہ بعد میں ویزا نہ ملنے کی وجہ سے ان کی شرکت نہیں ہو پائی، ایک بار رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں ان سے شکایت کی کہ اکیڈمی کا سیمینار آپ کے فیضان سے محروم رہتا ہے تو کہنے لگے: میں ہندوستان کی فقہ اکیڈمی کے پروگرام میں شرکت کا بہت مشتاق رہتا ہوں اور علماء ہند سے ان کے علم کے ساتھ ساتھ ورع وتقویٰ کی وجہ سے بہت محبت کرتا ہوں: ''واللہ انی لأحب علماء الهند لعلمهم ولو رعهم''، لیکن ہندوستان کا سفارت خانہ ویزا دینے میں بہت بخیل ہے، اور ایسا بھی نہیں ہوتا کہ سفارت خانہ شروع ہی میں ویزا دینے سے انکار کر دے؛ تاکہ میں آپ لوگوں سے رُجوع کروں اور آپ حضرات اندرون ملک سے اس کی کوشش کریں؛ بلکہ بار بار بلاتا اور ٹالتا رہتا ہے اور بالکل آخری مرحلہ میں جب کسی کوشش کا وقت باقی نہیں رہتا، ویزا دینے سے انکار کر دیتا ہے ـــــ لیکن سیمینار میں شریک نہ ہونے کے باوجود وہ اکثر وبیشتر سیمینار کے موضوع سے متعلق اپنی مطبوعہ یا تازہ تحریر بھیجا کرتے تھے اور اس سے مسائل کے حل میں بڑی مدد ملتی تھی۔

اکتوبر ۱۹۹۸ء میں انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد (پاکستان) نے امام ابوحنیفہؒ کی شخصیت

اور کارناموں پر ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا تھا، جس میں منتخب اصحابِ علم اور اہل قلم نے شرکت کی تھی، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے وفد نے بھی سیمینار میں شرکت کی، جو جناب محمد عبدالرحیم قریشی مرحوم، مولانا عتیق احمد بستوی، مولانا فہیم اختر ندوی اور اس حقیر پر مشتمل تھا، ہم سبھوں نے مقررہ عنوانات پر مقالات بھی پیش کئے اور بحث میں بھر پور حصہ بھی لیا، ڈاکٹر وہبہ زحیلی اس پروگرام کے اہم شرکاء میں تھے، اس موقع پر ان سے خوب ملاقاتیں رہیں، میں نے ان کی بے تکلفی کو دیکھتے ہوئے ایک سوال جو بہت دنوں سے ذہن میں تھا، کر ہی ڈالا، کہ آپ کسی خاص مذہب فقہی کے متبع ہیں یا خلیجی ممالک کے علماء کی طرح کسی خاص مذہب کے پیرو نہیں ہیں؟ انھوں نے کہا: میں مسلکاً شافعی ہوں، میں نے عرض کیا: لیکن آپ کی کتاب ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' میں آپ نے اس اعتدال کے ساتھ تمام مذاہب فقہ کو پیش کیا ہے اور انصاف کے ساتھ ان کے دلائل ذکر کئے ہیں کہ کوئی شخص اس کتاب کو پڑھ کر یہ نہیں سمجھ سکتا کہ آپ مسلکاً شافعی ہیں، ہماری اس بات پر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے: میں تمام ائمہ کے احترام کو واجب سمجھتا ہوں اور یہی علماء سلف کی شان رہی ہے، یہ مسلکی توسع ان کی کتابوں سے بھی ظاہر ہے۔

بلکہ بعض دفعہ یہ توسع حد اعتدال سے بڑھ جاتا، جیسے یہ حقیر مئی ۲۰۰۳ء میں حکومت ایران کی دعوت پر تہران گیا، وہاں ''اسلام اور گلوبلائزیشن'' کے موضوع پر سیمینار تھا، مختلف عرب علماء سیمینار میں شریک تھے، جن میں ڈاکٹر وہبہ زحیلی بھی تھے، سیمینار کی نشستیں مکمل ہونے پر ظہر وعصر کی نمازیں جمع تاخیر کے ساتھ ڈاکٹر وہبہ زحیلی کی امامت میں ادا کی گئیں، میں بھی جماعت میں شریک ہو گیا؛ کیوں کہ مسافر کے لئے جمہور فقہاء اہل سنت کے نزدیک جمع بین الصلاتین کی گنجائش ہے اور بعض فقہاء احناف کا بھی اس کے جواز کے طرف رجحان ہے اور ظاہر ہے کہ ڈاکٹر زحیلی مسافر تھے؛ لیکن اگلے وقت نماز کی امامت کے لئے ایک مقامی شیعہ عالم کے نام کا اعلان ہوا، میں نے وہاں نماز پڑھنے سے گریز کیا اور اوپر اپنے کمرے میں جا کر نماز ادا کی، میرے پاس اس تاخیر کا عذر بھی تھا کہ مجھے استنجاء اور وضوء کی حاجت تھی؛ لیکن شیخ زحیلی بے تکلف جماعت میں شریک ہوئے، میں نے بعد میں تنہائی میں عرض کیا کہ روافض کو چاہے عملاً صراحتاً کافر نہ کہیں؛ لیکن بعض قطعیات دین کے انکار یا اس کی رکیک تاویلات کی وجہ سے ان کے کفر کا شبہ ضرور موجود ہے، ایسی صورت حال میں چاہیں ہم ان کے ساتھ مروت ورواداری کا تعلق رکھیں؛ لیکن کیا ہمارے لئے یہ بات جائز ہوگی کہ ہم ان کی اقتدا میں نماز ادا کریں؟ شیخ نے کوئی واضح جواب نہیں دیا، صرف اتنا کہا کہ ایسا کرنا پڑتا ہے، میں نے محسوس کیا کہ شام میں چوں کہ اہل سنت اور اہل تشیع کی ملی جلی آبادی ہے اور حکومت شیعہ حضرات کی ہے، بہت سی مسجدوں میں شیعہ امام ہیں، شاید اس لئے شیخ کے ذہن میں یہ نرم پہلو ہو، جو ہندوستان کے علماء کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔

شیخ بڑے شفیق اور خورد نواز تھے، ان کی خورد نوازی اور حوصلہ افزائی کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک سفر میں انھوں نے خود ہی ''نوازل فقہیہ معاصرہ'' (جدید فقہی مسائل) کے بارے میں دریافت کیا کہ کیا وہ کتاب طبع ہوگئی ہے؟ میں نے نفی میں جواب دیا، کہنے لگے: میں نے اس کتاب میں دیکھا کہ نئے مسائل کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے، آپ اسے جلد طبع کرائیے اور جب طبع ہوجائے تو مجھے بھی بھیجئے، اس کے بعد مکہ مکرمہ میں ایک سیمینار میں حاضری ہوئی جس میں شیخ بھی شریک تھے، نوازل فقہیہ کی دونوں جلدوں کی کمپوزنگ ہوچکی تھی، میں نے کمپیوٹر سے اس کی تین چار کاپیاں مع ٹائٹل تیار کر لی تھیں اور ان کو ساتھ رکھا تھا، اس میں سے ایک کاپی انھیں پیش کی، انھوں نے خوشی کا اظہار کیا اور خوب دُعائیں دی، میرے لئے اس میں سبق ہے کہ اتنے بڑے عالم نے ایک چھوٹے سے طالب علم کو یاد رکھا، یہ یقیناً ان کی بڑائی اور وسیع الظرفی کی بات ہے۔

جب مجھے 'مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ' کا رکن منتخب کیا گیا اور وہاں ان سے ملاقات ہوئی تو بڑی خوشی کا اظہار کیا اور کہنے لگے: مولانا مجاہد صاحبؒ کی وفات ہی سے میرا احساس تھا کہ ہندوستان کی فقہ اکیڈمی سے کوئی ممبر ہونا چاہئے اور خاص کر آپ کو ہونا چاہئے؛ کیوں کہ آپ ان کے علمی وارث ہونے کے ساتھ ساتھ نسبی وارث بھی ہیں، مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ کی نشستوں میں بھی ان کی گفتگو بڑی توجہ سے سنی جاتی تھی اور تجویز کمیٹی میں بھی وہ شامل ہوا کرتے تھے۔

شیخ زحیلیؒ سے آخری ملاقات رابطہ کے اجلاس میں ہوئی، جس کا عنوان تھا ''العالم الاسلامی، مشکلات وحلول'' اس وقت بہارِ عرب اپنے شباب پر تھی اور شام میں ہونے والی جنگ ایسا لگتا تھا کہ بہت جلد بشار الاسد کے زوال اور ملک کی آزادی پر ختم ہوگی، شیخ زحیلیؒ کے بارے میں لوگوں کی شکایت تھی کہ ان کا جھکاؤ حکومت کی طرف ہے اور وہ اپوزیشن کی حمایت میں نہیں ہیں؛ اسی لئے لوگ ان سے کسی قدر کٹے ہوئے تھے، پروگرام میں جو تقریریں ہوئیں، ان میں بھی اشارہ اور کنایہ میں بعض مقررین نے ایسی باتیں کہیں، مجھے بھی شیخ کے بارے میں بتائے گئے اس رویہ پر افسوس ہوا، اور ایک دفعہ تنہائی میں جرأت رندانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں نے اس سلسلہ میں دبے لفظوں میں پوچھ ہی لیا، ان کے چہرے پر غم، افسردگی اور تاسف کی کیفیت طاری ہوگئی اور کہنے لگے کہ یہ مسلمانوں کی خونریزی اور مسلم ملکوں کی تقسیم در تقسیم کی بڑی سازش ہے، حقیقت یہ ہے کہ روس شروع سے بشار الاسد کا زبردست حامی ہے، اسرائیل نے تحریک آزادی شروع ہوتے ہی موجودہ شامی حکومت کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ایک ایسا ملک ہے جو ہمارے لئے بہت ہی مفید اور بے ضرر ہے اور گذشتہ چالیس سالوں سے اس ملک سے ایک پتھر بھی اسرائیل کی طرف نہیں پھینکا گیا؛ اس لئے ہمیں بہرحال اس حکومت کو برقرار رکھنا چاہئے اور یہ بات

ظاہر ہے کہ اسرائیل جس کا دوست ہو، امریکہ ضرور اس کا دوست ہوگا، تو جب دنیا کی دو بڑی طاقتیں اور مشرقِ وسطیٰ کی سب سے بڑی خاموش نیوکلیر طاقت اس حکومت کے ساتھ ہے تو اس حکومت کو ہٹانا کیسے ممکن ہے؛ اس لئے اس کا نتیجہ مسلمانوں کی خونریزی کے سوا کچھ نہ ہوگا، اس وقت تو ان کی یہ بات مجھے سمجھ میں نہیں آئی؛ لیکن بعد کے حالات نے ثابت کردیا ان کا تجزیہ صحیح تھا، افسوس کہ غلبۂ جوش اچھے خاصے سمجھ دار لوگوں کو بھی ہوش سے محروم کر دیتا ہے اور ان کے جذباتی فیصلے ایسا نقصان پہنچاتے ہیں کہ جس کی تلافی ممکن نہیں ہوتی، بہر حال یہی شیخ سے آخری ملاقات تھی، اس کے بعد پھر ملاقات کی نوبت نہیں آئی، یہاں تک کہ یہ بات سننے میں آئی کہ وہ شام کے حالات کی وجہ سے اپنے گاؤں منتقل ہو گئے ہیں اور بیمار بھی ہیں، بالآخر: ۲۳ر شوال ۱۴۳۶ھ، مطابق: ۸ر اگست ۲۰۱۵ء میں وفات ہوگئی، اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے۔ آمین

شیخ زحیلیؒ ان عبقری علماء میں تھے، جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کی علمی وفکری رہنمائی مدتوں اُمت کے لئے مشعلِ راہ بنی رہتی ہے، وہ ۱۹۳۲ء میں دمشق کے قریب ''دیر عطیہ'' میں پیدا ہوئے، ان کے والد ایک دین دار کاشتکار اور تاجر تھے، اللہ نے انھیں حفظ قرآن کی دولت سے نوازا تھا اور اپنی عملی زندگی میں بڑے ہی متبع سنت تھے، ابتدائی تعلیم اپنے شہر میں حاصل کی، پھر دمشق منتقل ہوئے اور چھ سال تعلیم حاصل کرتے ہوئے ۱۹۵۲ء میں امتیازی اور اول درجہ سے کامیابی حاصل کی، اس کے بعد دمشق یونیورسٹی اور جامعہ ازہر میں قانون، شریعہ اور فقہ میں ماسٹر اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں اور ہر امتحان میں کامیابی کے اوجِ کمال پر پہنچے۔

انھوں نے زندگی کا بڑا حصہ پیشۂ تدریس میں گزارا، جامعۃ الشارقہ میں ''کلیۃ الشریعۃ والدراسات الاسلامیۃ'' کے ڈین رہے، اس کے علاوہ دمشق یونیورسٹی، کویت یونیورسٹی، اُردن یونیورسٹی اور المعہد العالی للعلوم القانونیۃ والقضائیۃ وغیرہ میں تدریس کی خدمت انجام دی اور ہر جگہ بنیادی طور پر شریعہ اور قانون کے استاذ کے طور پر کام کیا۔

انھوں نے تصنیف وتالیف کی خدمت اس بڑے پیمانے پر انجام دی کہ ان کے معاصرین میں شاید ہی اس کی مثال مل سکے، غالباً ان کا تصنیفی سفر علامہ علاء الدین سمرقندی حنفی کی معروف کتاب ''تحفۃ الفقہاء'' کی احادیث کی تحقیق وتخریج سے شروع ہوا، ان کا زیادہ تر کام قرآن مجید اور فقہ پر ہے؛ لیکن تقریباً تمام ہی اسلامی علوم میں انھوں نے نمایاں خدمت انجام دی ہے، انھوں نے قرآن مجید کی ایک مختصر تفسیر ''التفسیر الوجیز'' کے نام سے لکھی ہے، دوسری مفصل تفسیر ''**التفسیر المنیر فی العقیدۃ والشریعۃ والمنہج**'' ۳۰ جلدوں میں ہے، اس تفسیر کو ۱۹۹۵ء میں عالم اسلام کی سب سے بہتر کتاب کا ایوارڈ ملا ہے اور وہ واقعی اس لائق ہے، مضامین کے احاطہ، حسن ترتیب، حسن تعبیر اور مسائل فقہیہ کی وضاحت، سورتوں کی مضمون کے اعتبار سے مختلف حصوں میں تقسیم اور ہر حصہ پر

مناسب عنوان لگانے ، نیز حل عبارات ، اسباب نزول کی وضاحت اور حسب ضرورت نحو وصرف اور بلاغت کے مباحث کے تذکرہ ، نیز قصص و واقعات کو تسلسل کے ساتھ پیش کرنے کے لحاظ سے اس کو اس عہد کی بہترین تفسیر کہا جاسکتا ہے، جو اساتذہ، طلبہ، واعظین ومقررین اور علمی وتحقیقی کام کرنے والوں کے لئے یکساں مفید ہے۔

فقہ ان کا اصل موضوع ہے؛ چنانچہ انھوں نے فقہ اسلامی کے مختلف پہلوؤں پر بڑی اہم کتابیں لکھی ہیں، قانون اور شریعت کے موازنہ پر نیز فقہ مقارن پر ان کی تصنیفات ہاتھوں ہاتھ لی گئیں؛ لیکن اس میدان میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' ہے، جس میں انھوں نے اہل سنت کے چاروں مذاہب کو بالتفصیل نقل کیا ہے، ہر مذہب کی رائے اس کی معتبر کتابوں سے لی گئی ہے، نیز پورے انصاف کے ساتھ ہر نقطۂ نظر کی دلیل بھی بیان کی گئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب مذاہب فقہیہ کی آراء کی ایک انسائیکلو پیڈیا ہے۔

انھوں نے عصر حاضر میں پیش آنے والے مسائل پر بھی بہت لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے خوب لکھا ہے، انھوں نے اپنی ان تحریروں کو'' موسوعۃ القضایا المعاصرۃ'' کے عنوان سے جمع کر دیا ہے، جو ۷ رجلدوں میں ہے اور واقعی عصر حاضر کے مسائل کی انسائیکلو پیڈیا کہلانے کی مستحق ہے، وہ ان مسائل پر بھی اس طرح قلم اُٹھاتے ہیں کہ موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ہوجائے، کتاب وسنت کی نصوص بھی سامنے آجائیں، فقہاء کے نقاط نظر بھی، مختلف مذاہب کی کتب فقہیہ کے مناسب حال اقتباسات بھی نقل کرتے ہیں، فقہی اُصول وقواعد کو بھی سامنے رکھتے ہیں، پھر شریعت کے مقاصد ومصالح اور دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے کسی رائے کو ترجیح دیتے ہیں، جو اکثر اعتدال اور میانہ روی پر مبنی ہوتی ہے۔

اُصولِ فقہ پر بھی ان کی خدمات بہت نمایاں ہیں، نظریۂ ضرورت، نظریۂ رُخصت اور احکام شرعیہ میں آسان پہلو کو لینے کے ضوابط، نیز سد ذریعہ وغیرہ پر بہت تفصیل سے لکھا ہے اور ان کی یہ تحریریں نہایت ہی چشم کشا اور مسافران علم وتحقیق کے لئے خضر طریق کا درجہ رکھتی ہیں، اس کے علاوہ اُصولِ فقہ پر ان کی مختصر، متوسط اور ضخیم تین کتابیں ہیں'' الوجیز فی اُصول الفقہ، الوسیط فی اُصول الفقہ الاسلامی، اور اُصول الفقہ الاسلامی کے نام سے دوجلدوں میں یہ تفصیلی کتاب اُصولِ فقہ کے موضوع پر ویسی ہی کتاب ہے، جیسی فقہ پر'' الفقہ الاسلامی وادلتہ'' اس میں مذاہب اربعہ کے اُصول علامہ ابن ہمام کی ترتیب پر مرتب کئے گئے ہیں، نظائر اور مثالوں سے ان کو واضح کیا گیا ہے اور شیخ کی دوسری کتابوں کی طرح اس میں بھی زبان وبیان کا حسن پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ فگن ہے۔

تفسیر، فقہ اور اُصولِ فقہ تو شیخ کا اصل موضوع ہے، جس سے ان کی شناخت قائم ہوئی؛ لیکن اس کے علاوہ دوسرے اسلامی علوم میں بھی ان کا بڑا تحریری ذخیرہ موجود ہے، جیسے حدیث میں ابن رجب حنبلی کی معروف کتاب

''جامع العلوم والحکم'' کی احادیث وآثار کی تخریج وتحقیق اور اس پر تعلیق، محی السنہ بغویؒ کی 'الانوار فی شمائل النبی المختار' کی تلخیص اور تخریج وتحقیق، شخصیات پر حضرت عبادہ بن صامتؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، امام سعید بن المسیبؒ اور امام شافعیؒ کے تذکرے، جو حسن بیان کا شاہکار ہیں، اسی طرح فضائل اخلاق اور رذائل اخلاق پر بھی دو ضخیم جلدوں میں آپ کی کتابیں بڑی اہم ہیں، جو خاص کر واعظین اور خطباء کے لئے سرمہ چشم بنانے کے لائق ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے شیخ کے اندر فطری ذہانت اور جدوجہد کا بے پایاں جذبہ تو عطا فرمایا ہی تھا؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھیں اپنے عہد کے اکابر اساتذہ سے استفادہ کا موقع بھی ملا اور وہ اپنی صلاحیت اور صالحیت کی وجہ سے ان کے مرکز توجہ بنے رہے؛ چنانچہ انھوں نے دمشق میں حدیث: شیخ محمود یاسین سے، عقائد: شیخ محمود رنکوسی سے، فرائض: شیخ حسن شطی سے، فقہ شافعی: ہاشم خطیب سے، اُصولِ فقہ اور اُصولِ حدیث: شیخ لطفی فیومی سے، تجوید: شیخ احمد سماق سے اور تلاوت کا علم: شیخ حمدی جویجاتی سے حاصل کیا، اسی طرح انھوں نے جامعہ ازہر میں شیخ الازہر شیخ محمود شلتوت، شیخ عیسیٰ منون اور شیخ جاد الرب رمضان سے استفادہ کیا۔

شیخ سے یوں تو ان کی تصنیفات کے واسطہ سے دنیا بھر کے علماء نے استفادہ کیا ہے؛ لیکن جن لوگوں نے براہ راست ان سے درسی فیض حاصل کیا ہے، ان میں بھی بڑی ممتاز شخصیتیں شامل ہیں، جن میں شیخ کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمد زحیلی، شیخ محمد فاروق حمادہ، شیخ محمد نعیم یاسین، شیخ محمد عبدالستار ابوغدہ، شیخ عبداللطیف فرفور، شیخ محمد ابولیل، شیخ محمد عبدالسلام عبادی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شیخ زحیلیؒ اپنے خالق ومالک کی بارگاہ میں پہنچ گئے؛ لیکن یقیناً وہ اس حال میں دنیا سے رُخصت ہوئے ہوں گے کہ شام کے حالات پر ان کی چشم دل اشکبار ہوگی، یہ ایک حقیقت ہے کہ صدیوں ملت اسلامیہ کے علماء اور علوم اسلامی کے اساتذہ وطلبہ انھیں فراموش نہیں کرسکیں گے، ان کے کارنامے ان کو زندہ رکھیں گے اور ان کی یادوں کی خوشبو تادیر اہل علم کے مشام جان کو معطر کرتی رہے گی۔

اللّٰھم ارحمہ وتقبل حسناتہ وتجاوز عن سیاتہ.

• • •

امام عیسیٰ بن ابانؒ — حیات وخدمات

مولانا عبید اختر رحمانی ☆

نام ونسب

نام عیسیٰ، والد کا نام ابان، اور دادا کا نام صدقہ ہے، پورا نسب نامہ یہ ہے: عیسیٰ بن ابان بن صدقة بن عدي بن مرادنشاہ، کنیت ابوموسی ہے، (۱) کنیت کے سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تقریباً سارے ترجمہ نگاروں نے جن میں قاضی وکیع، قاضی صیمری، خطیب بغدادی، ابن جوزی، حافظ ذہبی، حافظ عبدالقادر قرشی، حافظ قاسم بن قطلو بغا وغیرہ شامل ہیں، سبھی نے آپ کی کنیت ابوموسیٰ ذکر کی ہے، محض حافظ ابن حجر نے آپ کی کنیت ابومحمد ذکر کی ہے، (۲) اور کسی بھی تذکرہ نگار نے اس کی بھی صراحت نہیں کی ہے کہ آپ کی دو کنیت تھی، ہر ایک نے آپ کی محض ایک ہی کنیت 'ابوموسیٰ' کا ذکر کیا ہے، بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس بارے میں حافظ ابن حجر سے کسی قسم کا ذہول ہوا ہے۔

خاندان

عیسیٰ بن ابان کے خاندان کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں چلتا کہ ان کے بیٹے بیٹیاں کتنے تھے، اور دیگر رشتہ دار کون کون تھے، ایسا صرف عیسیٰ بن ابان کے ساتھ نہیں؛ بلکہ دیگر اکابرین کے ساتھ بھی ہوا ہے، عیسیٰ بن ابان کے حالات کی تلاش وتحقیق کے بعد ان کے دو رشتہ داروں کا پتہ چلتا ہے۔

ابوحمزہ بغدادی

آپ کا نام محمد، والد کا نام ابراہیم اور کنیت ابوحمزہ ہے، آپ کا شمار کبار صوفیاء میں ہوتا ہے، آپ نے اپنے عہد کے جلیل القدر محدثین سے علم حاصل کیا تھا، علم قرآت بالخصوص ابوعمرو کی قرات میں آپ ممتاز مقام کے مالک تھے،

☆ نگراں شعبۂ تحقیق: المعهد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

(۱) الفہرست لابن الندیم: ۱/ ۲۵۵، دارالمعرفة بیروت، لبنان۔ (۲) لسان المیزان: ۶/ ۲۵۶۔

دنیا جہان کا سفر کیا تھا، آپ کا حلقہ ارادت ومحبت کافی وسیع تھا، ایک جانب جہاں آپ جنید بغدادیؒ، سری سقطیؒ اور بشر حافیؒ جیسے اکابر صوفیاء کے ہم نشیں تھے تو دوسری جانب امام احمد بن حنبلؒ کی مجلس کے بھی حاضر باش تھے اور بعض مسائل میں امام احمد بن حنبل بھی آپ کی رائے دریافت کرتے تھے، تذکرہ نگاروں میں سے بعض نے آپ کو عیسیٰ بن ابان کا 'مولیٰ' قرار دیا ہے، جب کہ بعض نے آپ کو عیسیٰ بن ابان کی اولاد میں شمار کیا ہے، اس بارے میں شاید قول فیصل ابن الاعرابی کا قول ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے آپ کے بارے میں عیسیٰ بن ابان کی اولاد سے دریافت کیا تو انھوں نے اعتراف کیا کہ آپ کا سلسلہ نسب عیسیٰ بن ابان سے ہی ملتا ہے، (۱) آپ کا انتقال ۲۷۰ ہجری، مطابق ۸۸۳ء میں ہوا ہے۔ (۲)

نائل بن نجیح

نام اور کنیت ابوسہل ہے، نائل بن نجیح کو متعدد تذکرہ نگاروں نے عیسیٰ بن ابان کا ماموں قرار دیا ہے؛ لیکن مجھ کو اس وجہ سے توقف تھا کہ عیسیٰ بن ابان کے نام سے ایک اور راوی ہیں جو رقاشی ہیں، بظاہر بصرہ کا ہونے کی وجہ سے زیادہ احتمال یہی تھا کہ نائل عیسیٰ بن ابان حنفی کے ہی ماموں ہیں؛ لیکن کہیں اور اس کی وضاحت نہیں مل رہی تھی، تفتیش کے بعد یہ بات ملی کہ حافظ ابن کثیر نے وضاحت کی ہے کہ نائل بن نجیح، ابوسہل بصری اور جن کو بغدادی بھی کہا جاتا ہے، عیسیٰ بن ابان القاضی کے ماموں ہیں، قاضی کی وضاحت سے اس کی تعیین ہوگئی کہ نائل بن نجیح عیسیٰ صاحب تذکرہ عیسیٰ بن ابان کے ہی ماموں ہیں۔ (۳)

اساتذہ ومشائخ

آپ نے ابتداء میں کن سے تعلیم حاصل کی اور بعد ازاں کن شیوخ واساتذہ سے حدیث وفقہ کا حاصل کیا، اس بارے میں بہت کم معلومات ہیں، صرف اتنا تذکرہ ملتا ہے کہ ابتداء میں اصحاب حدیث میں تھے اور انھیں کے مسلک پر عمل پیرا تھے، بعد میں امام محمد سے رابطہ میں آنے پر حنفی فکر وفقہ سے متاثر ہوکر حنفی ہوگئے، ممتاز شافعی فقیہ ابواسحاق شیرازیؒ لکھتے ہیں :

> ومنهم أبو موسى عيسى بن أبان بن صدقة : وكان من أصحاب الحديث ثم غلب عليه الرأي ۔ (۴)

---

(۱) سیر اعلام النبلاء: ۱۳/ ۱۶۵، تاریخ دمشق: ۵۱/ ۲۵۲، ترجمہ نمبر: ۶۰۶۲۔　(۲) الاعلام للزرکلی: ۵/ ۲۹۴۔

(۳) التَّكْميل في الجَرْح والتَّعْدِيل ومَعْرِفة الثِّقَات والضُّعفاء والمجَاهِيل: ۱/ ۳۳۰۔

(۴) طبقات الفقہاء لابی اسحاق الشیرازی: ۵۰، مکتبہ مشکوٰۃ۔

اور ان میں سے (فقہاء حنفیہ) ایک عیسیٰ بن ابان بن صدقہ بھی ہیں وہ اصحاب حدیث میں تھے پھران پر فقہ غالب آ گئی۔

علم حدیث کی تحصیل انھوں نے اپنے عہد کے جلیل القدر محدثین سے کی، حافظ ذہبی اس بارے میں لکھتے ہیں :

وحدث عن : هشيم ، و إسماعيل بن جعفر ، ويحيى بن أبي زائدة . (۱)

ہشیم، اسماعیل بن جعفر اور یحییٰ بن ابی زائدہ سے انھوں نے روایت کیا ہے۔

امام عیسیٰ بن ابان کس طرح محدثین کی صف سے نقل کر اہل فقہ کی جماعت مین شامل ہوئے، اس تعلق سے ایک دلچسپ واقعہ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔

محدثین کی صف سے نکل کر فقیہ بننے کا دلچسپ واقعہ

خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں عیسیٰ بن ابان کے ترجمہ میں محمد بن سماعہ سے نقل کی ہے :

عیسیٰ بن ابان ہمارے ساتھ اسی مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے جس میں امام محمد بن حسن الشیبانی نماز پڑھتے تھے اور فقہ کی تدریس کے لئے بیٹھا کرتے تھے، میں (محمد بن سماعہ) عیسیٰ بن ابان کو محمد بن حسن الشیبانی کی مجلس فقہ میں شرکت کے لئے بلاتا رہتا تھا؛ لیکن وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ احادیث کی مخالفت کرتے ہیں، اصل الفاظ ہیں: ''هولاء قوم يخالفون الحديث'' عیسیٰ بن ابان کو خاصی احادیث یاد تھیں، ایک دن ایسا ہوا کہ فجر کی نماز ہم نے ساتھ پڑھی، اس کے بعد میں نے عیسیٰ بن ابان کو اس وقت تک نہ چھوڑا، جب تک کہ امام محمد بن حسن کی مجلس فقہ نہ لگ گئی، پھر میں ان کے قریب ہوا اور کہا یہ آپ کے بھانجے ہیں! یہ ذہین ہیں اور ان کو حدیث کی معرفت بھی ہے، میں ان کو جب بھی آپ کی مجلس فقہ میں شرکت کی دعوت دیتا ہوں تو یہ کہتے ہیں کہ آپ حضرات حدیث کی مخالفت کرتے ہیں، امام محمد ان کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا: اے میرے بیٹے! تم نے کس بناء پر یہ خیال کیا کہ ہم حدیث کی مخالف کرتے ہیں (یعنی ہمارے کونسے ایسے مسائل اور فتاویٰ ہیں، جس میں حدیث کی مخالفت کی جاتی ہے)، پھر اسی کے ساتھ امام محمد نے نصیحت بھی فرمائی: ''لا تشهد علينا حتى تسمع منا'' ہمارے بارے میں کوئی رائے تب تک قائم مت کرو جب تک ہمارا موقف نہ سن لو، عیسیٰ بن ابان نے امام محمد سے حدیث کے پچیس ابواب کے متعلق سوال کیا (جن کے بارے میں ان کو شبہ تھا کہ ائمہ احناف کے مسائل اس کے خلاف ہیں) امام محمد نے ان تمام پچیس ابواب حدیث کے متعلق جواب دیا اور ان احادیث میں سے جو منسوخ تھیں، اس کو بتایا اور اس پر

(۱) تاریخ الاسلام للذہبی: ۱۶/ ۳۱۲۔

دلائل اور شواہد پیش کئے، عیسیٰ بن ابان نے باہر نکلنے کے بعد مجھ سے کہا کہ میرے اور روشنی کے درمیان ایک پردہ حائل تھا جو اُٹھ گیا، میرا خیال ہے کہ اللہ کی زمین میں اس جیسا (صاحبِ فضل وکمال) کوئی دوسرا نہیں ہے، اس کے بعد انھوں نے امام محمد کی شاگردی اختیار کی۔(۱)

اس سند کے ایک راوی احمد بن مغلس الحمانی ہیں جن کی محدثین نے تضعیف اور تکذیب کی ہے؛ لیکن تاریخی شخصیات اور روایات کے بارے میں وہی شدت پسندی برقرار رکھنا جو کہ حدیث کے بارے میں ہے، ایک غلط خیال اور نظریہ ہے، یہ بات تقریباً ان کے بیشتر ترجمہ نگاروں نے بیان کی ہے کہ وہ اصحاب حدیث میں سے تھے، بعد میں انھوں نے فقہ کی جانب رُخ کیا، خطیب بغدادی کا بیان کردہ واقعہ ہمیں صرف یہ بتاتا ہے کہ محدثین کی جماعت میں سے نکل کر فقہاء کی جماعت میں وہ کیسے داخل ہو گئے، اس کا پس منظر کیا تھا اور بس، ظاہر ہے کہ اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے اس واقعہ کو قبول نہ کیا جائے، آخر کوئی تو وجہ ہوگی جس کی وجہ سے امام عیسیٰ بن ابان محدثین کی صف سے نکل کر فقہاء کی صف میں اور بطور خاص فقہاء احناف کی صف میں شامل ہوئے، جن کے خلاف ایک عام پروپگنڈہ کیا گیا تھا کہ وہ رائے کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں اور حدیث کی مخالفت کرتے ہیں، اسی پس منظر اور وجہ کو احمد بن مغلس الحمانی نے بیان کیا ہے، اور اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے، جس کی وجہ سے اس واقعے کو قبول نہ کیا جائے۔

امام محمد سے تحصیل فقہ

اس کے علاوہ حافظ ذہبی نے بھی سیر اعلام النبلاء میں اس کی وضاحت کی ہے کہ امام عیسیٰ بن ابان نے امام محمد سے تحصیلِ فقہ کیا تھا؛ چنانچہ وہ سیر اعلام النبلاء جلد:۱۰، صفحہ:۴۴۰ میں لکھتے ہیں:''وہ عراق کے فقیہ اور امام محمدؒ کے شاگرد تھے'' حافظ ابن حجر لسان المیزان میں لکھتے ہیں:''وتفقہ علیہ'' یعنی عیسیٰ بن ابان کے فقہ میں خصوصی استاد محمد بن الحسنؒ ہیں۔(۲)

عیسیٰ بن ابان نے کتنی مدت تک امام محمد سے تحصیل علم کیا، ابن ندیم نے الفہرست میں ذکر کیا ہے کہ انھوں نے امام محمدؒ سے بہت کم مدت تک تحصیل علم کیا:''ویقال انہ کان قلیل الأخذ عن محمد بن الحسن''(۳) یہی بات وکیع نے بھی اخبار القضاۃ میں لکھی ہے کہ ان کا امام محمد علیہ الرحمہ سے تحریری طور پر استفادہ کا تعلق کم رہا:

(۱) تاریخ بغداد:۱۲/ ۴۸۰، تحقیق: دکتور بشار عواد معروف، مطبع: دار الغرب الاسلامی۔

(۲) لسان المیزان:۶/ ۲۵۶۔ (۳) الفہرست لابن الندیم:۱/ ۲۵۴۔

''كان عيسى ابن أبان قليل الكتاب عَن مُحَمَّد بْن الْحَسَن ''(۱) الجواہر المضیئۃ فی طبقات الحنفیہ میں اس مدت کی تفصیل بیان کی گئی ہے کہ وہ مدت چھ مہینے کی تھی چنانچہ صاحب طبقات الحنفیہ ذکر کرتے ہیں۔

تفقه على محمد بن الحسن قيل أنه لزمه ستة أشهر . (۲)

لیکن مشکل یہ ہے کہ دونوں جگہ یعنی ابن ندیم کی الفہرست اور الجواہر المضیئۃ میں اس قول کو ''قیل'' سے نقل کیا گیا ہے جو کہ کمزور اقوال کے نقل کے لئے خاص ہے، جب کہ دوسری جانب ان کے ترجمہ نگاروں نے ان کے فقہ کے اساتذہ میں امام محمد کا خاص طور سے نام لیا ہے، اس سے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے کہ امام عیسیٰ بن ابان کی امام محمد کی شاگردی کی مدت خاصی طویل ہوگی، چھ مہینے کی مختصر مدت نہیں ہوگی، مشہور حنفی فقیہ قاضی صیمری امام طحاوی کے واسطہ سے ابوخازم سے نقل کرتے ہیں :

أخبرنَا عبد الله بن مُحَمَّد الْأَسدي قَالَ أنبأ أَبُو بكر الدَّامغَانِي الْفَقِيه قَالَ ثَنَا أَحْمد ابْن مُحَمَّد بن سَلمَة بن سَلامَة قَالَ سَمِعت أَبَا خازم يَقُول إِنَّمَا لزم عِيسَى بن أبان مُحَمَّد بن الْحسن سِتَّة أشهر ثمَّ كَانَ يكاتبه إِلَى الرقة ۔ (۳)

ابوخازم کہتے ہیں کہ عیسیٰ بن ابان نے امام محمد سے چھ مہینے براہ راست استفادہ کیا، بعد میں جب امام محمد کو ہارون رشید اپنے ساتھ رقہ لے گیا تو عیسیٰ بن ابان نے امام محمد سے خط وکتابت کے ذریعہ استفادہ کیا۔

صیمری کی نقل کردہ روایت تسلیم کرنے سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ بن ابان امام محمد کے ''رقہ'' چلے جانے کے بعد بھی خط وکتابت کے ذریعہ مستفید ہوتے رہے، ابن ابی العوام کی تصنیف 'فضائل ابی حنیفہ' سے معلوم ہوتا ہے کہ امام محمد سے براہ راست استفادہ کی مدت ۱۱ مہینے تھی؛ چنانچہ وہ ابوخازم سے ہی روایت نقل کرتے ہیں کہ امام محمد سے عیسیٰ بن ابان کے استفادہ یا شاگردی کی کل مدت گیارہ مہینے ہے :

أبا خازم القاضي يقول : قال لي عبد الرحمٰن بن نابل : ما جالس عيسى بن أبان محمد بن الحسن إلا أحد عشر شهراً ، وتوفي عيسى بن أبان سنة عشرين ومائتين . (۴)

---

(۱) اخبار القضاۃ: ۲/۱۷۱۔ (۲) الجواہر المضیئۃ فی طبقات الحنفیہ: ۲/۲۷۲، مکتبہ مشکوٰۃ۔

(۳) أخبار أبي حنيفة وأصحابه: ۱/۱۴۷، أبو عبد الله الصَّيْمَرِي الحنفي (المتوفى: ۴۳۶ھ) عالم الكتب، بيروت۔

(۴) فضائل أبي حنيفة وأخباره ومناقبه: ۱/۳۶۰، الناشر: المكتبة الامدادية، مكة المكرمة۔

ابو خازم قاضی کہتے ہیں کہ مجھ سے عبدالرحمٰن بن نابل نے کہا: عیسیٰ بن ابان کے امام محمد سے استفادہ کی کل مدت گیارہ مہینے ہے اور عیسیٰ بن ابان کا انتقال ۲۲۰ھ میں ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ ماقبل میں جو کچھ عرض کیا گیا، یہ تمام ہی باتیں تحقیق کے معیار پر پوری نہیں اُترتی ہیں، امام محمد کا رقہ جانا ان کے انتقال سے کئی برس قبل کا واقعہ ہے، آپ رقہ میں کتنی مدت رہے، اس کے بارے میں بروکلمان نے لکھا ہے کہ کئی سال رہے، پھر رقہ کے قضاء سے آپ کو معزول کردیا گیا ہے، اس درمیان آپ بغداد میں رہے، پھر قاضی القضاۃ بنائے گئے اور پھر ہارون رشید کے ساتھ رُے گئے تھے اور وہیں انتقال ہوگیا، (۱) اس سے واضح ہے کہ عیسیٰ بن ابان نے آپ سے کئی سال تک استفادہ کیا ہے؛ کیوں کہ رقہ کا واقعہ امام محمد کی وفات سے کئی سال قبل کا ہے اور یہ بالکل غیر فطری ہے کہ رقہ میں جب تک امام محمد رہیں تو عیسیٰ بن ابان ان سے خط وکتابت کے ذریعہ استفادہ کریں؛ لیکن جب امام محمد معزول ہوکر بغداد میں تشریف فرما ہوں تو عیسیٰ بن ابان استفادہ نہ کریں، اور جب رَے چلے جائیں تو سابق کی طرح خط وکتابت سے استفادہ نہ کریں، ماقبل میں جتنے اقوال امام محمد سے استفادہ کے سلسلے میں گزرے ہیں، ان کے بارے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ ابتداء کی مدت بتائی جارہی ہے کہ عیسیٰ بن ابان کو ابتداء میں کس قدر استفادہ کا براہ راست موقع ملا۔

امام محمد علیہ الرحمہ سے طویل استفادہ کا ہی فیض تھا کہ عیسیٰ بن ابان کی امام محمدؒ کے اقوال وعلوم پر گہری نگاہ تھی، جو بات دوسروں کو معلوم نہیں ہوتی تھی وہ عیسیٰ بن ابان کے علم میں ہوتی تھی؛ چنانچہ ایک واقعہ میں انھوں نے وراثت کے مسئلہ میں نواسوں اور پوتوں کے درمیان فرق کرتے ہوئے فیصلہ صادر کیا تو بعض فقہاء احناف نے ان پر ائمہ احناف کے قول سے باہر نکلنے کر فیصلہ کرنے کی بات کہی، عیسیٰ بن ابان نے کہا: میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ امام محمد کا بھی قول ہے، اس کو بکار بن قتیبہ، ہلال بن یحییٰ اور امام محمد کے دوسرے شاگرد جان نہ سکے؛ لیکن ابوخازم نے اعتراف کیا کہ یہ امام محمد بن حسن کا ہی قول ہے اور عیسیٰ بن ابان سچ کہتے ہیں۔ (۲)

امام محمد نے امام ابو یوسف سے کوئی استفادہ کیا یا نہیں کیا، اس بارے میں عیسیٰ بن ابن کے تمام سوانح نگار خاموش ہیں، قاضی وکیع لکھتے ہیں: ''ولم يخبرني إنسان أنه رآه عند أبي يوسف'' (۳) ''مجھے کسی بھی شخص نے یہ نہیں بتایا کہ اس نے عیسیٰ بن ابان کو ابو یوسف کے پاس دیکھا ہے'' اس سے انداز ہوتا ہے کہ عیسیٰ بن ابان نے امام ابو یوسف سے استفادہ نہیں کیا ہے، امام ابو یوسف سے استفادہ نہ کرنے کی وجہ شاید یہ ہوگی کہ آپ نے

---

(۱)　تفصیل کے لئے دیکھئے: امام محمد بن الحسن شیبانی اور ان کی فقہی خدمات: ۱۱۳ تا ۱۲۵۔

(۲)　اخبار ابی حنیفۃ: ۱/۱۵۲۔　　(۳)　اخبار القضاۃ: ۲/۱۷۱۔

امام محمد کا دامن ان کے انتقال سے کچھ برس پہلے تھاما اور امام محمد کے انتقال سے کئی برس قبل امام ابو یوسف کا انتقال ہو چکا تھا یعنی جس وقت وہ امام محمد سے وابستہ ہوئے ،اس سے پہلے امام ابو یوسف کا انتقال ہو چکا تھا اور جب امام ابو یوسف باحیات تھے تو ان سے اہل حدیث اور اہل الرائے کے درمیان تنفر کی وجہ سے استفادہ نہ کر سکے۔

تلامذہ

مختلف ذمہ داریوں بالخصوص کارقضا کے نازک فریضہ کی ادائیگی کے ساتھ عیسیٰ بن ابان نے درس وتدریس کا فریضہ بھی انجام دیا،عیسیٰ بن ابان کی بہتر تعلیم وتربیت کا نتیجہ تھا کہ آپ کے شاگرد آگے چل کر آسمان علم وفضل کے آفتاب وماہتاب ہوئے،عیسیٰ بن ابان کے چند ممتاز شاگردوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

ہلال بن یحییٰ الرائے

آپ کا شمار فقہ حنفی کے ممتاز ترین فقہاء میں ہوتا ہے، بصرہ کے قاضی رہے،آپ عیسیٰ بن ابان کے شاگرد ہیں،اور آپ نے ہی اولاً علم شروط وسجلات میں تصنیف کی۔(۱)

ابوخازم

آپ کا نام عبدالحمید اور والد کا نام عبدالعزیز ہے،ابوخازم کنیت ہے،آپ بصرہ کے رہنے والے تھے،شام کوفہ کرخ بغداد وغیرہ میں آپ نے قضا کی ذمہ داریاں انجام دی،علم وعمل اور زہد وورع میں آپ کا مقام بہت بلند ہے،امام طحاوی آپ کے شاگرد ہیں۔(۲)

بکار بن قتیبہ

آپ کے علمی کمال بالخصوص فقہ وحدیث کی جامعیت پر محدثین کا اتفاق ہے،۲۴۶ھ میں آپ مصر کے قاضی بنے؛لیکن ابن طولون کے ایک حکم کی تعمیل اپنی اُصول پرستی کی بنا پر نہ کر سکنے کی وجہ سے قید کر دیئے گئے،قید میں بھی حدیث وفقہ کا درس جاری رہا،لوگ مسائل پوچھنے کے لئے آیا کرتے تھے،امام طحاوی آپ کے خاص شاگرد ہیں،دوران قید ہی آپ کا انتقال ہوا،رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔(۳)

حسن بن سلام السواق

آپ کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتی ہیں،آپ نے اپنے دور کے جلیل القدر محدثین سے حدیث کا

---

(۱) تاریخ الاسلام للذہبی:۵/۱۲۷۷۔ (۲) سیر اعلام النبلاء:۱۳/۵۳۹ (۳) الاعلام للزرکلی:۲/۶۱۔

علم حاصل کیا، آپ حدیث کے معتبر راوی ہیں، حافظ ذہبی نے آپ کو الامام، الثقۃ، المحدث کے گرانقدر الفاظ سے یاد کیا ہے، ۲۷۷ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔(۱)

صورت وسیرت

امام عیسیٰ بن ابان کو اللہ تعالیٰ نے حسن صورت کے ساتھ ساتھ حسن سیرت سے بھی نوازا تھا، آپ بڑے حسین وجمیل تھے، ابن سماعہ جوان کے رفیق بھی تھے، وہ کہتے ہیں: 'کان عیسیٰ حسن الوجہ'(۲) عیسیٰ بن ابان خوبصورت شخص تھے، آپ صرف حسین ہی نہیں تھے؛ بلکہ عفیف بھی تھے، دوسرے لفظوں میں کہیں تو حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت سے بھی پورے طور پر متصف تھے، ابن ندیم الفہرست میں لکھتے ہیں: (وہ پاک دامن شخص تھے)''وکان عیسی شیخا عفیفا''۔(۳)

ذہانت وفطانت

ابو خازم جو اپنے دور کے انتہائی نامور قاضی وفقیہ تھے، ان کا قول ہے، میں نے اہل بصرہ کے نوجوانوں میں عیسیٰ بن ابان اور بشر بن الولید سے زیادہ ذہین کسی کو نہیں دیکھا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ابتداء سے ہی بہت ذہین وفطین تھے، حافظ ذہبی نے بھی ان کے ترجمہ میں ایک جگہ ان کو''وکان معدود من الاذکیاء'' کے الفاظ سے یاد کیا ہے یعنی وہ منتخب ترین ذہین لوگوں میں سے ایک تھے، (۴) حافظ ذہبی نے ہی دوسری جگہ ان کو ذکاء مفرط (وفور ذہانت) سے متصف کیا ہے:''وَلَهُ تَصَانِيْفُ وَذَكَاءٌ مُفْرِطٌ''۔(۵)

فقہ وحدیث میں مقام ومرتبہ

عیسیٰ بن ابان کا دور علم حدیث وفقہ کا زریں دور ہے، آپ نے اپنے عہد کے مشہور اور جلیل القدر محدثین سے حدیث کا علم حاصل کیا تھا اور خاصی بڑی عمر تک آپ کا تعلق محدثین کے گروہ کے ساتھ تھا، اور امام محمد سے رابطہ سے قبل آپ کی دلچسپی کا محور فقط علم حدیث ہی تھا، آپ کو اللہ نے جس ذہانت وفطانت سے نوازا تھا، اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ آپ کا علم حدیث میں بھی ممتاز مقام تھا، یہی وجہ ہے کہ ابن سماعہ جیسے مشہور محدث اور فقیہ کا آپ کا

(۱) سیر اعلام النبلاء: ۱۳/ ۱۹۲۔
(۲) الجواہر المضیئۃ فی طبقات الحنفیہ: ۱/ ۴۰۱۔
(۳) الفہرست لابن الندیم: ۱/ ۲۵۴۔
(۴) تاریخ الاسلام للذہبی: ۱۶/ ۳۱۲۔
(۵) سیر اعلام النبلاء: ۱۰/ ۴۴۰۔

متعلق یہ کہنا تھا:''وکان عیسی حسن الحفظ للحدیث''(۱)عیسیٰ بن ابان حدیث کواچھی طرح یادرکھنے والے تھے،ابن سماعہ نے جب عیسیٰ بن ابان کاامام محمد سے تعارف کرایاتو یہ کہا:''هَذَا ابْن اَخِيكَ أبان بن صَدَقَة الْكَاتِب وَمَعَهُ ذكاء وَمَعْرِفَة بِالْحَدِيثِ''(۲)یہ آپ کے بھتیجے ابان بن صدقہ ہیں، یہ ذہین ہیں اورعلم حدیث سے گہری واقفیت رکھتے ہیں، پھراسی واقعہ میں یہ بھی اعتراف ہے کہ امام محمد سے انھوں نے حدیث کے پچیس ابواب کے متعلق اپنے اشکالات دوہرائے ،جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو علم حدیث میں کتنا ممتاز مقام حاصل تھا، اگر یہ سب اعتراف نہ بھی ہوتا، تب بھی ان کی کتاب الحج الصغیر کا جو خلاصہ امام جصاص رازی نے ''الفصول فی الاصول''میں پیش کیا ہے، اس کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا علم حدیث میں مقام کتنا بلند اورحدیث وآثار سے اُصول وفروع کے استنباط میں آپ کو کتنی مہارت اورکتنارسوخ تھا،احادیث وآثار سے آپ نے احناف کے اُصول فقہ پر جوداد تحقیق دی ہے، اس کو دیکھ کر بے ساختہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ امام شافعی کے بعد اُصولِ فقہ پر اس طرح سے مجتہدانہ کلام کی نظیر نہیں ملتی۔

امام محمد کی شاگردی میں آپ کی خفتہ صلاحیتوں کو جلاملی اورجلد ہی انھوں نے فقہ میں درک اورمہارت حاصل کرلی اوررفتہ رفتہ فقہ کے فن شریف میں اتنی مہارت پہنچائی کہ اس دور کے اور بعد کے جلیل القدرفقہاء اس فن میں آپ کی معرفت تامہ اوررسوخ کامل کے معترف ہوگئے ؛ بلکہ بعض اجلہ علماء نے تو آپ کی تعریف میں یہاں تک کہہ دیا:ابتداءاسلام سے لے کرعیسیٰ بن ابان کے قاضی ہونے تک ان سے زیادہ بڑافقیہ بصرہ میں کوئی قاضی نہیں ہوا۔

جلیل القدر علماء کے اعترافات

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بکار بن قتیبہ کو کہتے سنا وہ ہلال بن یحییٰ کا قول نقل کررہے تھے کہ مسلمانوں میں عیسیٰ بن ابان سے فقاہت میں بڑھا ہوا قاضی کوئی اورنہیں ہے :

قال الطحاوي سمعت بكار بن قتيبة يقول سمعت هلال بن يحي يقول ما في الإسلام قاض أفقه منه يعني عيسى بن أبان في وقته ـ (۳)

جب کہ قاضی بکار بن قتیبہ خود کہتے ہیں :

قال الطحاوي وسمعت بكار بن قتيبة يقول كنا لنا قاضيان لا مثل لهما إسماعيل بن حماد وعيسى بن أبان ـ

(۱) اخبارابی حنیفۃ واصحابہ:۱/۱۳۲۔ (۲) حوالۂ سابق:۱/۱۳۲۔ (۳) حوالۂ سابق:۱/۱۵۰۔

امام طحاوی کہتے ہیں کہ میں بکار بن قتیبہ سے سنا ہے کہ ہمارے (فقہاء حنفیہ) دو قاضی ایسے ہیں جن کی کوئی مثال نہیں، ایک اسماعیل بن حماد اور دوسرے عیسیٰ بن ابان۔(۱)

خود حافظ حافظ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں ان کے فضل وکمال کا اعتراف ''فقیہ العراق'' کے الفاظ سے کیا ہے،(۲) اور تاریخ اسلام میں نام کے ساتھ ''الفقیہ'' کا لاحقہ لگایا ہے،(۳) مشہور شافعی عالم ابواسحاق الشیرازی نے طبقات الفقہاء میں ان کو احناف کا ممتاز فقیہ تسلیم کیا ہے، حافظ عبدالقادر القرشی نے ''الامام الکبیر'' کے گرانقدر لقب سے متصف کیا ہے، (۴) تو حافظ قاسم بن قطلو بغا نے ''أحد الأئمة الأعلام'' کا گراں قدر لقب تحریر کیا ہے، (۵) اور اسی کے ساتھ ان کے ''وسعت علم'' کا بھی اعتراف کیا ہے،(۶) مشہور حنفی مورخ ابوالمحاسن یوسف بن تغری بردی لکھتے ہیں: ''وكان مع كرمه من أعيان الفقهاء''(۷) سخاوت کے ساتھ ساتھ آپ ممتاز فقہاء میں سے ایک تھے، مشہور حنفی امام وعلامہ زاہد الکوثری آپ کے علم وفضل کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حاصل کلام یہ کہ عیسیٰ بن ابان علم فقہ کے پہاڑ تھے، جس کی بلندی اور عظمت کے سامنے سب سر جھکانے لگے۔(۸)

دار القضاء کی ذمہ داری

قضاء کی ذمہ داری بہت بھاری اور گرانقدر ذمہ داری ہے، اس میں مسائل واحکام کی واقفیت کے ساتھ ساتھ مردم شناسی اور لوگوں کے مزاج سے واقفیت، بیداری مغزی اور کسی کی ظاہری صورت سے متاثر نہ ہونے کی شرطیں شامل ہیں، عیسیٰ بن ابان ان اوصاف سے متصف تھے؛ لہٰذا ان کی ان ہی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے عباسی خلافت میں مامون الرشید کے دور میں قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم نے ان کو مامون کے ساتھ ''فم الصلح'' جاتے وقت عسکر مہدی میں اپنا نائب بنایا اور پھر واپسی پر ان کو مستقل طور پر بصرہ کا قاضی بنا دیا، خطیب بغدادی نے بیان کیا ہے کہ ان کو ۲۱۱ھ میں اسماعیل بن حماد کی معزولی کے بعد بصرہ کا قاضی بنایا گیا تھا اور تاحیات وہ بصرہ کے قاضی رہے، اس زمانہ میں بصرہ علمی لحاظ سے عالم اسلام کے گنے چنے شہروں میں شمار ہوتا تھا، ایسے میں ان کو بصرہ کا قاضی بنانا یہ بتاتا ہے کہ قاضی یحییٰ بن اکثم ان کے علم وفضل سے کتنے متاثر تھے؟

---

(۱) الجواہر المضئیۃ: ۱/۴۰۱۔
(۲) سیر اعلام النبلاء: ۱۰/۴۴۰۔
(۳) تاریخ الاسلام ۵/۶۵۱۔
(۴) الجواہر المضئیۃ: ۱/۴۰۱۔
(۵) تاج التراجم: ۱/۲۲۷۔
(۶) حوالۂ سابق۔
(۷) النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ: ۲/۲۳۶۔
(۸) سیرت امام محمد بن الحسن الشیبانی: ۲۰۷۔

قضا کے باب میں ان کی خاص صفت یہ تھی کہ وہ اپنے حکموں کا اجراء اور فیصلوں کا نفاذ بہت جلد کرایا کرتے تھے ؛ چنانچہ ابن ندیم ان کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :''**کان فقیہا سریع الانفاذ للحکم** '' وہ فقیہ تھے اور حکم کو جلد نافذ کرتے تھے ، (۱) یہی بات قاضی وکیع نے بھی لکھا ہے :''**وکان عیسی سہلاً فقیہاً سریع الانقاذ للأحکام** '' (۲) عیسیٰ نرم رو، فقیہ تھے اور اپنے احکام جلد نافذ کرایا کرتے تھے، قاضی وکیع نے لکھا ہے کہ بسا اوقات وہ فیصلوں کے نفاذ میں اس تیزی سے کام لیتے تھے، جس سے بعض حضرات کو شبہ ہوتا تھا کہ احکام کا اتنا تیز اجرا ونفاذ قاضیوں کے لئے مناسب ہے یا نہیں ہے؟ قضا کے باب میں آپ کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ جب تک آپ کو زیر بحث معاملہ کے فیصلہ پر پورا اطمینان نہ ہو جاتا ، فیصلہ صادر نہ کرتے ، چاہے اس میں کتنی ہی تاخیر کیوں نہ ہو جائے اور اگر کوئی اصرار کرتا تو صاف فرما دیتے : کہ قاضی کو تمہارے مسئلہ کے بارے میں علم نہیں ہے، اگر تم چاہو تو انتظار کرو یا پھر چاہو تو کسی دوسرے کے پاس جاؤ۔ (۳)

جود وسخا

آپ نے مالدار گھرانے میں آنکھیں کھولی تھیں، یہی وجہ ہے کہ آپ کی پوری زندگی مالداروں کی سی گزری اور اس مالداری کے ساتھ اللہ نے آپ کی فطرت میں سخاوت کا مادہ بدرجہ اتم رکھا تھا، بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ قرضدار قرض ادا نہ کر سکا اور قرض خواہ قرضدار کو جیل میں بند کرانے کے لئے لایا اور آپ نے قرض خواہ کو اس کی رقم اپنی جیب سے ادا کر دی۔

خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے ان کی عدالت میں محمد بن عباد المہلبی پر چار سو دینار کا دعویٰ کیا، عیسیٰ بن ابان نے ان سے اس بارے میں پوچھا تو انھوں نے مقروض ہونے کا اعتراف کیا، اس شخص نے قاضی عیسیٰ ابن ابان سے کہا کہ آپ اس کو میرے حق کی وجہ سے قید کر دیجئے، عیسیٰ بن ابان نے کہا کہ تمہارا حق اس پر واجب ہے؛ لیکن ان کو قید کرنا مناسب نہیں ہے، اور جہاں تک بات تمہارے چار سو دینار کی ہے تو وہ میں تمہیں اپنی جانب سے دے دیتا ہوں۔ (۴)

خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں قاضی ابو حازم سے نقل کیا ہے کہ عیسیٰ بن ابان بہت سخی شخص تھے اور ان کا قول تھا کہ اگر میرے پاس کسی ایسے شخص کو لایا گیا جو میرے جتنا ہی سخی ہے تو میں اس کو سزا دوں گا ، یا اس کو اپنے مال میں تصرف سے روک دوں گا ، (۵) حافظ ذہبی بھی سیر اعلام النبلاء میں ان کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:''**وَفِیْہِ سَخَاءٌ وَجُودٌ زَائِد**''۔(۶)

---

(۱) الفہرست لابن الندیم:۱/۲۵۴۔ (۲) اخبار القضاۃ:۲/۱۷۰۔ (۳) اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ:۱/۱۵۰۔
(۴) تاریخ بغداد:۱/۴۸۰۔ (۵) تاریخ بغداد:۱۲/۴۷۹۔ (۶) تاریخ الاسلام:۱۶/۳۲۰۔

حساب اور فلکیات میں مہارت

فقہاء احناف کا امام محمد کے دور سے ایک خاص وصف یہ رہا ہے جس میں وہ دیگر مسالک کے فقہاء سے ممتاز رہے ہیں کہ ان کو علم حساب سے بڑی اچھی اور گہری واقفیت رہی ہے، امام محمد کو حساب کے فن میں گہرا رسوخ تھا اور انھوں نے حساب دانی کے اس فن کو اُصول سے فروع کی تفریع میں بطور خاص استعمال کیا، دکتور دسوقی اس ضمن میں لکھتے ہیں :

> امام محمد جس طرح عربی زبان میں امام تھے، اسی طرح حساب میں بھی آگے تھے، اُصول سے فروع اخذ کرنے میں ماہر تھے، قاری کے لئے آپ کی کتاب الاصل یا الجامع الکبیر کا مطالعہ کر لینا یہ جاننے کے لئے کافی ہوگا کہ امام محمد کو مسائل پیش کرنے اور ان کے احکام بیان کرنے میں گہری مہارت حاصل تھی، آپ کو حسابی حصوں اور ان کی مقداروں پر علمی قدرت تھی۔(۱)

امام محمد کی فقہی تفریعات کی ان ہی باریکیوں اور دقائق سے امام احمد بن حنبل نے بھی فائدہ اُٹھایا؛ چنانچہ جب ان سے ابراہیم حربی نے سوال کیا کہ یہ باریک اور دقیق مسائل آپ نے کہاں سے حاصل کیے، تو انھوں نے امام محمد کی خدمات کا پورا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا: امام محمد کی کتابوں سے۔(۲)

امام محمدؒ سے حساب کا یہ فن ان کے شاگردوں نے بھی سیکھا اور اس میں کمال پیدا کیا؛ چنانچہ عیسیٰ بن ابان کے تذکرہ میں ان کے معاصرین اور شاگردوں نے اعتراف کیا کہ آپ کو حساب کے فن میں کامل دستگاہ تھی اور نہ صرف حساب کے فن میں ؛ بلکہ آپ کو فلکیات میں بھی مہارت حاصل تھی ؛ چنانچہ اسی اعتبار سے آپ اپنے کام کو ترتیب دیا کرتے تھے، آپ کے شاگرد ہلال بن یحییٰ الرائے کہتے ہیں :

> هلال الرأي يقول : لقد كتب عيسى بُن أبان سجلات لآل جعفر بُن سليمان ، مواريث مناسخة ، وحسب حسابها وكتب ذلك في الكتب بأمر يصير به المفتي فصلاً عَن القضاة قَالَ : هلال : هَلْ والله لو سكت عَن ذلك التفصيل لضقت ذرعاً به . (۳)

ہلال الرائے کہتے ہیں کہ عیسیٰ بن ابان نے جعفر بن سلیمان کے لئے دستاویزات

---

(۱) امام محمد بن الحسن الشیبانی اور ان کی فقہی خدمات:۱۸۶۔

(۲) مناقب الامام ابی حنیفہ وصاحبیہ :۸۶۔ (۳) أخبار القضاۃ:۲/۱۷۲۔

لکھیں، جس میں وراثت کے احکام اور وراثت کی تقسیم کا پورا حساب تھا اور اس کے ساتھ ایسے قواعد وضوابط بھی بیان کئے تھے جس کی ضرورت مفتی اور قاضی دونوں کو پڑتی ہے، ہلال کہتے ہیں: خدا کی قسم اگر وہ اتنی تفصیل سے یہ سب نہ لکھتے تو مجھے بڑی پریشانی ہوتی۔

عباس بن میمون آپ کی فلکیات دانی کے بارے میں لکھتے ہیں :

عباس بن میمون سمعت أهل المسجد والأجرياء يقولون : أحدث عيسى في القضاء شيئاً لم يحدثه أحد لعلمه بحساب الدور .(۱)

عباس بن میمون کہتے ہیں کہ میں نے مسجد والوں اور پڑوسیوں کو کہتے سنا کہ عیسیٰ بن ابان نے علم حساب کی مدد سے قضا میں ایک نئی چیز ایجاد کی ہے اور وہ ہے فلکیات کے علم سے کام لینا۔

اس کے بعد انھوں نے تفصیل بتائی ہے کہ وہ فلکیات کے علم سے واقفیت کا کس طرح مفید استعمال کرتے تھے۔

تصنیفات وتالیفات

قضاء کی ذمہ داریوں اور درس وتدریس کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ انھوں نے تصنیف وتالیف کی خدمات بھی انجام دی ہیں، اور بطور خاص اُصول فقہ میں گرانقدر اضافہ کیا ہے، ان کے تقریباً تمام ہی ترجمہ نگاروں نے ان کے نام کے ساتھ ''صاحب التصانیف'' کا اضافہ کیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تصنیف کے لحاظ سے بہت مشہور تھے اور ان کی تصانیف کی خاصی تعداد رہی ہوگی، اُصول فقہ کے مختلف موضوعات پر انھوں نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، مختلف مصنفین جنھوں نے ان کی تصنیفات کا فہرست دی ہے، ہم اس کا ترتیب وار ذکر کرتے ہیں :

(۱) کتاب الحجۃ
(۲) کتاب خبر الواحد
(۳) کتاب الجامع
(۴) کتاب اثبات القیاس
(۵) کتاب اجتہاد الرائے۔(۲)

---

(۱) أخبار القضاۃ: ۲/۱۷۲۔ (۲) الفہرست لابن الندیم: ۱/۲۵۵۔

امام جصاص رازیؒ نے درج ذیل کتاب کا اضافہ کیا ہے :

(۶) الحج الصغیر۔(۱)

صاحب ہدیۃ العارفین نے درج ذیل کتابوں کا اضافہ کیا ہے :

(۷) الحجۃ الصغیرۃ فی الحدیث: (اس کا پتہ نہیں چلا کہ آیا یہ وہی الحج الصغیر ہے، جس کا تذکرہ جصاص رازی نے کیا ہے، یا پھر الگ سے کوئی اور کتاب ہے)۔

(۸) کتاب الجامع فی الفقۃ

(۹) کتاب الحج

(۱۰) کتاب الشہادات

(۱۱) کتاب العلل

(۱۲) کتاب فی الفقۃ۔(۲)

گیارہویں نمبر پر موجود کتاب کا نام معجم المولفین میں ''العلل فی الفقہ ہے اور شاید یہی زیادہ صحیح بھی ہے۔(۳)

(۱۲) الحج الکبیر فی الرد علی الشافعی القدیم: اس کتاب کا تذکرہ علامہ زاہد الکوثری نے کیا ہے، اس کے علاوہ علامہ لکھتے ہیں :

> اس کے علاوہ عیسیٰ بن ابان نے ایک کتاب حدیث قبول کرنے کی شروط کے سلسلہ میں مریسی اور شافعی کے رد میں بھی لکھی، عیسیٰ بن ابان نے اپنی کتابوں میں وہی اُصول بیان کئے، جن کو امام محمد سے انھوں نے حاصل کیا تھا۔(۴)

کتابوں کے نام سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے دور میں محدثین اور اہل فقہ کے درمیان اختلافی مسائل پر قلم اُٹھایا ہے، مثلاً: ''کتاب اثبات القیاس''، بعض شدت پسند ظاہری محدثین کا موقف تھا کہ قیاس کرنا صحیح نہیں اور وہ شرعی دلیل نہیں ہے، اس کی تردید میں یہ کتاب لکھی گئی ہوگی، اسی طرح اس زمانے میں محدثین جہاں ایک طرف خبر واحد کو قطعی اور یقینی دلیل مانتے تھے، دوسری جانب معتزلہ اور دیگر گمراہ فرقے خبر واحد کی اہمیت کم کر رہے تھے، ایسے عالم میں انھوں نے خبر واحد پر قلم اُٹھایا اور احناف کا موقف سامنے رکھا۔

---

(۱) الفصول فی الاصول: ۱/ ۱۵۶۔

(۲) ہدیۃ العارفین أسماء المؤلفین وآثار المصنفین: ۱/ ۸۰۶، دار إحیاء التراث العربی، بیروت لبنان۔

(۳) معجم المولفین: ۸/ ۱۸، مکتبۃ المثنی، بیروت۔

(۴) سیرت امام محمد بن الحسن الشیبانی، اُردو ترجمہ بلوغ الامانی فی سیرت الامام محمد بن الحسن الشیبانی: ۲۰۷۔

الحجج الصغیر

عیسیٰ بن ابانؒ کی دیگر کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی ناپید ہے؛ لیکن خوش قسمتی سے اب امام جصاص رازیؒ کی ''الفصول فی الاصول''، طبع ہوکر آ گئی ہے، اس کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا امام جصاصؒ کی یہ کتاب الحجج الصغیر کی شرح یا اس کا بہتر خلاصہ ہے، تقریباً تمام مباحث میں انھوں نے الحجج الصغیر سے استفادہ کیا ہے اور الا ماشاء اللہ ایک دو مقامات کو چھوڑ کر ہر جگہ وہ عیسیٰ بن ابان کے ہی موقف کے حامل نظر آتے ہیں، گو یا اس کتاب کے واسطہ سے براہ راست نہ سہی؛ لیکن بہت قریب سے ہم عیسیٰ بن ابان کے نظریات وخیالات سے واقف ہو سکتے ہیں، صاحب کشف الظنون حاجی خلیفہ اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں :

وحجج عیسی بن أبان أدق علماً ، وأحسن ترتیباً من کتابي المزني . (۱)

اورعیسیٰ بن ابان کی حجج (شاید الصغیر مراد ہو) علم کی باریکی اور ترتیب کے حسن کے لحاظ سے مزنی کی دونوں کتابوں سے بہتر ہے۔

اسی کتاب میں عیسیٰ بن ابان نے اپنا وہ مشہور نظریہ دوہرایا ہے، جس کی بنیاد پر احناف آج تک مخالفین کے طعن وتشنیع کے شکار ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ فقیہ نہیں تھے اور ان کی وہ روایت جو قیاس کے خلاف ہوگی رد کردی جائے، (راقم الحروف کا بحث ونظر کے شمارہ نمبر: ۱۰۷ میں اسی کے بارے میں ایک مضمون ''فقاہت راوی کی شرط اور احناف کا موقف'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جس میں عیسیٰ بن ابانؒ اور بعد کے علماء جنھوں نے عیسیٰ بن ابان کی رائے اختیار کی ہے، کے بارے میں حوالوں سے بتایا ہے کہ عیسیٰ بن ابان کی یہ رائے مطلق نہیں ہے؛ بلکہ تین یا چار شرطوں کے ساتھ مقید ہے اور اگر ان شرائط کا لحاظ وخیال رکھا جائے تو پھر عیسیٰ بن ابان اور دوسروں کے نظریہ میں اختلاف حقیقی نہیں بلکہ محض لفظی بن کر رہ جاتا ہے)۔

کتاب الحجج کی تصنیف

اس کی تصنیف کا ایک دلچسپ پس منظر ہے، مامون الرشید کے قریبی رشتہ دار عیسیٰ بن ہارون ہاشمی نے کچھ احادیث جمع کیں اور ان کو مامون الرشید کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ احناف جو آپ کے دربار میں اعلیٰ مناصب اور عہدوں پر مامور ہیں، ان کا عمل اور مسلک وموقف ان احادیث کے خلاف ہے اور یہ وہ حدیثیں ہیں، جس کو ہم

(۱) کشف الظنون: ۱/ ۶۳۲، مکتبۃ المثنی، بغداد۔

دونوں نے اپنے عہد تعلیم میں محدثین کرام سے سنا ہے، یہ بات سن کر مامون نے اپنے دربار کے حنفی علماء کو اس کا جواب لکھنے کے لئے کہا؛ لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا، وہ مامون کو پسند نہ آیا، یہ دیکھ کر عیسیٰ بن ابان نے کتاب الحجج تصنیف کی ،جس میں انھوں بتایا کہ کسی روایت کو قبول کرنے اور نہ کرنے کا معیار کیا ہونا چاہئے اور اس میں انھوں نے امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے دلائل بھی بیان کئے، جب مامون الرشید نے یہ کتاب پڑھی تو بہت متاثر ہوا اور بے ساختہ کہنے لگا :

حسدوا الفتى إذا لم ينالوا سعيه فالنّاس أعداءٌ له و خصوم
كضرائر الحسّناء قلن لوجهها حسداً و بغياً إنّه لذميم

کسی بھی باصلاحیت آدمی کا جب مقابلہ نہیں کیا جاسکتا تو لوگ اس سے حسد کرنے لگتے ہیں اوراس کے دشمن بن جاتے ہیں جیسا کہ خوبصورت عورت کی سوتنیں محض جلن میں کہتی ہیں کہ وہ تو بدصورت ہے۔(۱)

تصنیفات کے باب میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عیسیٰ بن ابان نے ایک کتاب بطور خاص امام شافعی کے رد میں لکھی تھی ، اس کتاب کے بارے میں تاریخ بغداد کی روایت کے مطابق داؤد ظاہری اور اخبار القضاۃ کے مصنف قاضی کا الزام ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی تصنیف میں سفیان بن سحبان (۲) سے احادیث کے سلسلے میں مدد لی تھی، قاضی وکیع لکھتے ہیں :

وقيل لي إن الأحاديث التي ردها على الشافعي أخذها من كتاب سُفْيَان بْن سحبان ۔ (۳)

مجھ سے کہا گیا ہے کہ وہ احادیث جو عیسیٰ بن ابان نے امام شافعی کے رد میں اپنی کتاب میں لکھی لکھی ہیں، سفیان بن سحبان کی کتاب سے ماخوذ ہے۔

اور داؤد ظاہری سے جب عیسیٰ بن ابان کی کتاب کا جواب دینے کے لئے کہا گیا تو انھوں نے کہا کہ عیسیٰ بن ابان کی اس کتاب کی تصنیف میں ابن سختان نے مدد کی ہے۔(۴)

---

(۱) بحوالہ تاج التراجم : ۱/۷ ۲۲ ، تاریخ الاسلام للذہبی : ۱۶/ ۲۰ ۳، اس واقعہ کو سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ صیمری نے اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ:۱/۷ ۱۴ میں بیان کیا ہے۔ (۲) یہ سفیان بن سحبان فقہائے احناف میں سے ہیں اور امام محمدؒ کے شاگرد ہیں، تاریخ بغداد میں سفیان بن سختیان ہے جس کی تصحیح الفہرست لابن الندیم اور تاج التراجم لابن قطلوبغا سے کردی گئی ہے۔
(۳) اخبار القضاۃ لوکیع :۲/۱۷۱۔ (۴) تاریخ بغداد:۶/ ۲۱، دارالکتب العلمیۃ۔

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ عیسیٰ بن ابان پر اس سلسلے میں ابن سحبان سے مدد لینے کا الزام ایک غلط الزام ہے اور اس کی تردید خود عیسیٰ بن ابان نے کی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں ہی یہ چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں کہ ان کی فلاں تصنیف ابن سحبان کی اعانت کا نتیجہ ہے، کسی نے جا کر پوچھ لیا تو انھوں نے بات واضح کر دی اور یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ وہ کونسی کتاب ہے :

قال أبو خازم : فسمعت الصريفيني شعيب بن أيوب يقول : قلت لعيسى ابن أبان : هل أعانك على كتابك هذا أحدٌ ؟ قال : لا ، غير أني كنت أضع المسألة وأناظر فيها سفيان بن سختيان . (۱)

ابوخازم کہتے ہیں، میں نے شعیب بن ایوب کو یہ کہتے سنا کہ میں نے عیسیٰ بن ابان سے پوچھا کہ اس کتاب (کتاب الحج) کی تصنیف میں کیا کسی نے آپ کی مدد کی ہے؟ فرمایا کہ نہیں! ہاں اتنی سی بات تھی کہ میں اولاً مسئلہ کو لکھ لیتا تھا، پھر اس کے بعد اس بارے میں سفیان بن سختیان سے مناظرہ کرتا تھا۔

عیسیٰ بن ابان کے ناقدین

ہر وہ شخص جو مجتہدانہ فکر ونظر کا مالک ہو، ہر مسئلہ میں جمہور کے ساتھ نہیں چلتا؛ بلکہ بسا اوقات وہ اپنی راہ الگ بناتا ہے، بقول غالب ''ہر کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد''، امام عیسیٰ بن ابان کے بھی بعض نظریات وخیالات ایسے ہیں، جن سے جمہور اتفاق نہیں کرتے اور جن پر ان کے معاصرین اور بعد والوں نے تنقید کی ہے، ان پر جن لوگوں نے تنقید کی ہے، ان کا مختصر جائزہ پیش خدمت ہے۔

امام طحاوی

آپ کے سوانح نگاروں نے آپ کی تصنیفات کے ضمن مین ایک کتاب کا ذکر کیا ہے، جس کا نام 'خطا الکتب' ہے، اس میں ایک باب یا کوئی خاص فصل عیسیٰ بن ابان کے رد میں ہے۔(۲)

ابن سیریج

مشہور شافعی فقیہ ہیں، ان کے حالات میں ترجمہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انھوں نے ایک کتاب عیسیٰ بن ابان کے فقہی آراء کے رد میں لکھی ہے: ''وله رد على عيسى بن أبان العراقي في الفقه''۔(۳)

(۱) فضائل أبي حنيفة وأخباره ومناقبه: ۱/ ۳۶۰، الناشر: المكتبة الامدادية، مكة مكرمه۔ (۲) الجواهر المضية في طبقات الحنفية: ۱/ ۱۰۴۔
(۳) موسوعة أقوال أبي الحسن الدارقطني في رجال الحديث وعلله: ۱/ ۶۷، عالم الكتب للنشر والتوزيع۔

اسماعیل بن علی بن اسحاق

آپ نے بھی ایک کتاب عیسیٰ بن ابان کے رد میں لکھی ہے، جس کا نام ہے ''**النقض علی مسألة عیسی بن أبان في الاجتهاد**'' مصنف کا تعلق شیعہ سے فرقہ سے ہے، (۱) کتاب کے نام سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عیسیٰ بن ابان علیہ الرحمہ کی جو کتاب الاجتہاد فی الرائے ہے، یہ کتاب اسی کی تردید میں لکھی گئی ہے۔

خلق قرآن کے موقف کا الزام اور حقیقت

امام عیسیٰ بن ابان پر سب سے بڑا اور سنگین الزام خلق قرآن کے عقیدہ کے حامل ہونے کا ہے، یہ الزام مشہور شافعی محدث حافظ ابن حجر نے لگایا ہے، (اگرچہ حافظ ابن حجر سے پہلے بھی کچھ لوگوں نے خلق قرآن کے موقف کا الزام لگایا ہے؛ لیکن انھوں نے قیل کے ساتھ یہ بات کہی ہے یا دیگر صیغہ تمریض کے ساتھ) حافظ ابن حجر کے تعلق سے اگرچہ متعدد احناف کو شکایت رہی ہے کہ وہ احناف کے ترجمہ میں اس فیاضی اور دریادلی کا مظاہرہ نہیں کرتے، جو شوافع کے ساتھ برتتے ہیں، ان شکوہ وشکایات سے قطع نظر خلق قرآن یا دوسری کسی بھی جرح کے ثبوت کے لئے کچھ پیمانے ہیں، پہلا پیمانہ یہ ہے کہ جو امام جرح وتعدیل کسی راوی پر کوئی جرح کر رہا ہے، اس علم جرح وتعدیل کے ماہر تک صحیح سند سے یہ جرح ثابت ہو، دوسرا پیمانہ یا معیار یہ ہے کہ یہ جرح بادلیل ہو، تیسرا معیار یہ ہے کہ جس پر الزام لگایا جارہا ہے، اس کا موقف اسی کے الفاظ میں ثابت ہو۔

سب سے پہلے یہ الزام تاریخ بغداد میں خطیب بغداد نے لگایا ہے؛ چنانچہ خطیب بغدادی تاریخ بغداد میں لکھتے ہیں:

> **و یُحکی عن عیسی انه کان یذهب الی القول بخلق القرآن ۔ (۲)**
>
> عیسیٰ بن ابان سے نقل کیا جاتا ہے کہ وہ خلق قرآن کا عقیدہ رکھتے تھے۔

یہی بات حافظ ذہبی نے بھی تاریخ الاسلام میں دہرایا ہے:

> **ویُحکی عنه القول بخلق القرآن ، أجارنا الله ، وهو معدودٌ من الأذکیاء ۔ (۳)**
>
> ان سے خلق قران کا قول نقل کیا گیا ہے، اللہ ہمیں اس سے بچائے، اور وہ ذہین ترین لوگوں میں سے ایک تھے۔

---

(۱) لسان المیزان: ۱/ ۴۲۴۔ (۲) تاریخ بغداد: ۱۲/ ۴۸۲۔ (۳) تاریخ الاسلام للذہبی: ۱۶/ ۳۱۲۔

یہی بات ابن جوزی نے بھی کہی ہے :

وىذكر عنه أنه كَانَ يذهب إِلَى القول بخلق القرآن . (۱)

اوران کے بارے میں ذکر کیا جاتا ہے کہ ان کا موقف خلق قرآن کا تھا۔

واضح رہے کہ خطیب بغدادی نے جس سند سے اس حدیث کو روایت کیا ہے، اس میں بعض مجہول اور بعض ضعیف راوی ہیں، جس کی وجہ سے یہ سند اس قابل نہیں کہ اس کی وجہ سے کسی پر خلق قرآن کا سنگین الزام عائد کیا جائے، علاوہ ازیں خطیب نے اس روایت کو نقل کرنے کے باوجود خلق قرآن کے الزام کو صیغہ تمریض کے ساتھ بیان کیا ہے، اگر یہ سند ان کے نزدیک صحیح ہوتی تو وہ اس کو ضرور بالضرور جزم اور قطعیت کے ساتھ نقل کرتے اور یہی بات حافظ ذہبی کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے، جن کے رجال کی معرفت اور علم جرح وتعدیل میں گہرائی وگیرائی پر اتفاق ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دو مؤرخ یعنی خطیب بغدادی اور حافظ ذہبی اس قول کو تمریض کے صیغہ کے ساتھ نقل کرتے ہیں، جو اس بات کی نشاندہی ہے کہ ان کا خلق قرآن کے عقیدہ کا حامل ہونا ضعیف قول ہے، کوئی پکی بات نہیں ہے؛ چنانچہ خود حافظ ذہبی نے جب سیر اعلام النبلاء میں ان کا ترجمہ نقل کیا تو عقیدہ خلق قرآن کے حامل ہونے کی بات نقل نہیں کی؛ کیوں کہ وہ پکی بات نہ تھی؛ چنانچہ سیر اعلام النبلاء میں حافظ ذہبی عیسیٰ بن ابان کے ترجمہ میں محض اتنا ہی نقل کرتے ہیں :

فَقِيْهُ العِرَاقِ ، تِلْمِيْذُ مُحَمَّدِ بنِ الحَسَنِ ، وَقَاضِي البَصْرَةِ ، حَدَّثَ عَنْ : إِسْمَاعِيْلَ بنِ جَعْفَرٍ ، وَهُشَيْمٍ ، وَيَحْيَى بنِ أَبِي زَائِدَةَ ، وَعَنْهُ : الحَسَنُ بنُ سَلاَّمٍ السَّوَّاقُ ، وَغَيْرُهُ ، وَلَهُ تَصَانِيْفُ وَذَكَاءٌ مُفْرِطٌ ، وَفِيْهِ سَخَاءٌ وَجُودٌ زَائِدٌ ، تُوُفِّيَ : سَنَةَ إِحْدَى وَعِشْرِيْنَ وَمائَتَيْنِ ، أَخَذَ عَنْهُ : بَكَّارُ بنُ قُتَيْبَةَ . (۲)

عراق کے فقیہ ہیں، محمد بن الحسن کے شاگرد ہیں اور بصرہ کے قاضی تھے، انھوں نے اسماعیل بن جعفر، ہشیم، یحیی بن ابی زائدہ سے روایت بیان کی ہے اور ان سے حسن بن سلام السواق اور دیگر نے روایت بیان کی ہے، ان کی متعدد تصانیف ہیں وہ بہت زیادہ ذہین تھے اسی کے ساتھ وہ بہت سخی بھی تھے، ۲۲۱ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

(۱) المنتظم فی تاریخ الأمم والملوک: ۱۱/ ۶۷، دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔ (۲) سیر اعلام النبلاء للذہبی: ۱۰/ ۴۴۱۔

اگر خلق قرآن کے عقیدہ کی بات پکی ہوتی تو کیا یہ مناسب تھا کہ حافظ ذہبی اس کا یہاں ذکر نہ کرتے، ضرور کرتے جیسا کہ سیر اعلام النبلاء میں انھوں نے دوسرے خلق قرآن کے عقیدہ کے حاملین کا ذکر کیا ہے، پھر دیکھئے حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں ان کا صرف ایک سطری جملہ لکھتے ہیں اور اس میں بھی خلق قرآن کے عقیدہ کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے؛ بلکہ صاف صاف یہ کہتے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے ان کی توثیق یا تضعیف کی ہے :

عيسى بن أبان ، الفقيه صاحب محمد بن الحسن ما علمت أحدا ضعفه ولا وثقه ۔ (۱)

خلق قرآن کے عقیدہ کا حامل ہونا بجائے خود ایک جرح ہے اور اس کے حاملین مجروح رواۃ میں شمار ہوتے ہیں اور کسی کے مجروح یا ضعیف راوی ہونے کے لئے اس کا خلق قرآن کے عقیدہ کا حامل ہونا بھی کافی ہے، اس کے باوجود حافظ ذہبی صاف صاف کہہ رہے ہے کہ: ''ماعلمت احدا ضعفه ولا وثقه'' کیا یہ اس کی بات بالواسطہ صراحت نہیں ہے کہ عیسیٰ بن ابان کی جانب خلق قرآن کا جو عقیدہ منسوب کیا گیا ہے، وہ غلط اور بے بنیاد اور انتہائی کمزور ولچر بات ہے، ان سب کے برخلاف حافظ ابن حجر لسان المیزان میں لکھتے ہیں :

لكنه كان يقول بخلق القرآن ويدعو الناس إليه ۔ (۲)

عیسیٰ بن ابان نہ صرف خلق قرآن کے قائل تھے؛ بلکہ وہ اس کے داعی بھی تھے۔

حافظ ابن حجر کے علاوہ کسی بھی دوسرے ترجمہ نگار نے جس میں شوافع اور احناف سبھی شامل ہیں، عیسیٰ بن ابان پر خلق قرآن کے عقیدہ کا الزام نہیں لگایا ہے، چاہے وہ مشہور شافعی فقیہ ابواسحاق شیرازی صاحب طبقات الفقہاء ہوں، حافظ عبدالقادر قرشی ہوں، حافظ قاسم بن قطلو بغا ہوں۔

اس تفصیل سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ خلق قرآن کا الزام لگانے کے سلسلے میں حافظ ابن حجر منفرد ہیں، اور انھوں نے اپنے دعویٰ کی بھی کوئی دلیل بیان نہیں کی ہے، اور دعویٰ کی جب تک کوئی دلیل نہ ہو، اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

حافظ ابن حجر نے خلق قرآن کی بات ضرور نقل کی ہے اور اس کا داعی بھی بتایا ہے؛ لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے سامنے ایسی کونسی نئی بات اور نئی دلیل تھی کہ جو چیز خطیب بغدادی اور ذہبی کے یہاں صیغہ تمریض کے ساتھ ادا کی جارہی تھی، وہ یہاں آکر صیغہ جزم میں بدل گئی، اور جس میں وہ محض ایک عقیدہ کے حامل نظر آتے ہیں، وہ یہاں آکر داعی میں بدل جاتے ہیں، جتنے ماخذ اس وقت تک ہمارے سامنے ہیں، اس میں سے کسی سے بھی حافظ ابن حجر کے قول کی تائید نہیں ہوتی۔

---

(۱) میزان الاعتدال: ۵/ ۳۷۴۔ (۲) لسان المیزان، ابن حجر: ۴/ ۳۹۰۔

علم جرح وتعدیل کی رو سے بھی حافظ ابن حجر کی یہ بات اس لئے غیر معتبر ہے کہ حافظ ابن حجر عیسیٰ بن ابان کے معاصر نہیں، بہت بعد کے ہیں، لازماً ان کی یہ بات کسی واسطہ اور سند سے منقول ہونی چاہئے، اور سند یا کسی معاصر شخصیت کی شہادت کا اہتمام خود حافظ ابن حجر نے نہیں کیا ہے، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ علم جرح وتعدیل کی رو سے بھی ان کی یہ بات نا قابل قبول ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ لسان المیزان میں حافظ ابن حجر کے ذہبی پر بہت سارے تعقبات اور اضافے ہیں، اس میں سے ایک یہ بھی ہے، اس کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ جہاں بھی حافظ ابن حجر نے ذہبی کے کسی قول پر اعتراض کیا ہے، با حوالہ کیا ہے، محض اپنے قول کے طور پر ذکر نہیں کیا ہے۔

ہاں جن لوگوں کو اصرار ہے کہ وہ خلق قرآن کے عقیدہ کے حامل اور داعی تھے تو انھیں چاہئے کہ وہ ان کے معاصر کسی شخصیت کا کوئی قول یا کوئی سند پیش کریں۔

دوسری بات یہ ہے کہ خلق قرآن کے الزام کی حقیقت پر غور کرنے کے لئے چند باتیں ذہن میں رکھنی ضروری ہیں، ایک تو یہ کہ یہ عقیدہ خلق قرآن ایک مبہم لفظ ہے، محض کسی کا یہ کہہ دینا کہ فلاں خلق قرآن کا قائل تھا، کافی نہیں ہے، یہ واضح ہونا چاہئے کہ وہ کن الفاظ میں خلق قرآن کا قائل تھا، ورنہ تو خلق قرآن کا الزام یا دیگر سنگین الزامات مشہور محدثین پر بھی لگے ہیں؛ لیکن جب ان کے ہی الفاظ میں ان کے موقف کو جانا گیا تو حقیقت واضح ہوگئی۔

اس کی واضح مثال خود امام بخاری کا واقعہ ہے جب امام ذہلی سے وابستہ ایک شخص نے امام بخاری سے اس مسئلہ میں پوچھا تو انھوں نے اس مسئلہ کی حقیقت کو صاف اور واضح کرتے ہوئے کہا تھا کہ جو قرآن کی کی تلاوت ہم کرتے ہیں، وہ افعال مخلوق ہونے کے لحاظ سے مخلوق ہے، ورنہ قرآن کلام اللہ ہونے کے لحاظ سے غیر مخلوق ہے، ان کے الفاظ ہیں: ''القران کلام الله غیر مخلوق ، وافعال العباد مخلوقة والامتحان بدعة'' (۱)

اگر خلق قرآن کے سلسلے میں ہمارے سامنے امام بخاری کی عبارت نہ ہو محض ذہلی کا بیان اور ابوحاتم وابوزرعہ کی تنقید ہوتو کوئی بھی امام بخاری کو خلق قرآن کے عقیدہ کا قائل قرار دے دے گا، دوسری بات یہ بھی ہے خلق قرآن کے معاملہ میں امام احمد بن حنبل کی آزمائش کے بعد امام احمد بن حنبلؒ اور دیگر محدثین شدید ذکی الحس ہوگئے اور اس تعلق سے اگر کوئی ان کے الفاظ سے ہٹ کر کچھ کہتا تو وہ اسے برداشت نہ کرتے اور فوراً اس کے متروک اور ضعیف ہونے یا خلق قرآن کے قائل ہونے کی بات کہہ دیتے تھے، تفصیل کے لئے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی تصنیف لطیف وقیم:

''مسألة خلق القرآن وأثرها في صفوف الرواة والمحدثين وكتب الجرح والتعديل''

کی جانب رُجوع کریں، اس میں انھوں نے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور حوالوں کے ساتھ بتایا ہے کہ آگے چل کر اس مسئلہ میں محدثین کے درمیان کس قدر غلو ہو گیا تھا۔

---

(۱) ہدی الساری: ۴۹۴۔

آپ کا انتقال

آپ تادم واپسیں بصرہ کے قاضی رہے، آپ کو معزول کرنے کی بعض حضرات نے کوشش کی ؛ لیکن قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم اور ابن ابی داؤد تک کو آپ کو معزول کرنے کی ہمت نہیں ہوئی ، محمد بن عبداللہ کلبی کہتے ہیں کہ میں انتقال کے وقت ان کے پاس موجود تھا، انھوں نے مجھ سے کہا کہ ذرا میرے مال و دولت کا شمار تو کردو، میں نے حساب کیا تو بہت زیادہ مال نکلا، پھر انھوں نے فرمایا کہ مجھ پر جو قرضے ہیں، ان کو جوڑ کر بتاؤ کہ کل قرضہ کتنا ہے؟ جب میں نے ان کے قرضوں کو جوڑا تو پایا کہ یہ ان کی کل مالیت کے قریب ہے، اس پر عیسیٰ بن ابان کہنے لگے، اسلاف کہا کرتے تھے کہ ''زندگی مال داروں کی سی جیو اور موت فقیروں کی سی ہونی چاہئے''۔(۱)

بالآخر وہ گھڑی آ ہی گئی جس سے ہر ایک کو دوچار ہونا ہے، اور جو نہ ٹل سکتی ہے، نہ آگے پیچھے ہوسکتی ہے، ماہ صفر کی ابتدائی تاریخ اور ۲۲۱ھ میں علم کا یہ آفتاب غروب ہوگیا۔

امام عیسیٰ بن ابان کا انتقال کب ہوا، اس بارے میں مؤرخین کے اقوال مختلف ہیں، بعض نے ۲۲۰ھ قرار دیا ہے جب کہ بعض نے ۲۲۱ھ بتایا ہے ؛ لیکن ۲۲۱ھ کا قول زیادہ معتبر ہے ؛ کیوں کہ خلیفہ بن خیاط جن کا انتقال عیسیٰ بن ابان کے محض ۱۹-۲۰ر سال بعد ہوا ہے، انھوں نے عیسیٰ بن ابان کی تاریخ وفات ۲۲۱ھ ہی بتائی ہے، علاوہ ازیں خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ ماہ صفر کی ابتداء ۲۲۱ھ میں ان کا انتقال ہوگیا، اسی طرح حافظ ذہبی نے تاریخ الاسلام اور سیر اعلام النبلاء میں بھی تاریخ وفات ۲۲۱ھ ہی ذکر کیا ہے اور حافظ ذہبی چوں کہ انتقال کی تاریخ وغیرہ بتانے میں کافی محتاط ہیں اور اس سلسلے میں بہت احتیاط اور تحقیق سے کام لیتے ہیں ؛ لہٰذا ان مورخین کی بات زیادہ معتبر ہے۔

• • •

(۱) اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ: ۱/۱۴۹۔

حضرت مولانا مفتی اشرف علی باقویؒ

رفتید ولے نہ از دلِ ما !

خالدسیف اللہ رحمانی

جنوبی ہند میں یوں تو دینی مدارس کا نظام بہت پہلے قائم ہوگیا تھا، جامعہ باقیات الصالحات ویلوراور جامعہ نظامیہ حیدرآباد، دارالعلوم دیو بند کا ہم عصرادارہ ہے، علماء کی بڑی تعداد نے ان مدارس سے کسب فیض کیا ہے اور آج بھی ان کا فیض جاری ہے؛ لیکن کرناٹک اور تامل ناڈو میں جس شخصیت نے مدارس کے قیام کو ایک تحریک کی شکل دی اور جگہ جگہ مدارس قائم کئے، وہ ہیں: حضرت مولانا ابوالسعود باقویؒ (امیر شریعت اول کرناٹک)، حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کی تحریک دعوت وتبلیغ کا بھی ان صوبوں میں آپ نے ہی تعارف کرایا اور اس کے لئے مسلسل جد وجہد کی؛ بلکہ قربانی بھی دی، اور دعوت وتبلیغ کی نسبت کی وجہ سے باقیات الصالحات جیسے باوقار ادارہ سے سبکدوشی کو قبول کیا، اللہ نے ان کو چار فرزند دیئے، انھوں نے ان سبھوں کو علم دین سے آراستہ کیا، ماشاء اللہ یہ سبھی علمی اور دینی اعتبار سے بلند مقام کو پہنچے، اور جہاں رہے، لوگوں کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بن کر رہے، ان میں سب سے چھوٹے صاحبزادے حضرت مولانا لطف اللہ صاحب اس وقت بقید حیات ہیں، اللہ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے، تیسرے صاحبزادے حضرت مولانا قاری امداد اللہ انجمؒ کی وفات سب سے پہلے ہوئی، وہ فن قرأت کے رمز شناس اور خوش الحان قاری تھے، شعر وسخن کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، دوسرے صاحبزادے حضرت مولانا ولی اللہ رشادیؒ قاسمی تھے، جو جنوبی ہند کے بافیض ادارہ جامعہ معدن العلوم وانمباڑی کے مہتمم اور شیخ الحدیث تھے اور مواقیت نماز میں بڑی مہارت رکھتے تھے، یہ حقیر بھی اس مسئلہ میں ان سے رُجوع کرتا تھا، وہ بہت اچھے خطیب، مقرر اور اپنے علاقہ کے مقبول رہنما بھی تھے، ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد ہے، جو جنوبی ہند کے مختلف علاقوں میں مصروف خدمت ہے۔

حضرت مولانا ابوالسعود صاحبؒ کے سب سے بڑے فرزند ارجمند اور ان کے علمی وفقہی جانشیں حضرت مولانا مفتی اشرف علی باقوی نوراللہ مرقدہ تھے، درمیانہ قد، کھلتا ہوا رنگ، متوسط بدن، چہرہ پر خاص قسم کی کشش،

سفید دو پلی ٹوپی اور اس پر سفید رومال، سفید کرتا، سفید تہبند، الغرض سر سے پاؤں تک سفید لباس میں ملبوس، گویا نور کا پیکر، بولتے تو ٹھہر ٹھہر کر، الفاظ ایسے گویا گلاب کے پھول، ملتے تو مسکرا کر، مہمان کا استقبال کچھ اس طرح کرتے کہ پہلی ہی ملاقات میں انسان اپنا دل دے دیتا، تواضع وفروتنی اور وقار ومتانت کی صفات مشکل سے یک جا ہوتی ہیں؛ لیکن آپ کے اندر یہ دونوں خوبیاں جمع ہوگئی تھیں، کیا مجال کہ زبان سے کوئی ایسا لفظ نکل جائے، جو بے موقع ہو، اور ممکن نہیں کہ کوئی ادا ایسی ہو، جو حاضرین کو ناگوار گذرے، یہ تھے حضرت امیر شریعت دوم مفتی اشرف علی باقویؒ۔

بڑے منجھے ہوئے باکمال استاذ، پچاس سال سے زیادہ بخاری کا درس دیا اور حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند نے اپنے ہاتھوں اپنے اِس محبوب شاگرد کو عنفوان شباب میں مشیخت حدیث کی مسند پر بیٹھایا اور ان پر بھرپور اعتماد کا اظہار فرمایا، مجھے ان کے درس میں باضابطہ شرکت کا شرف تو حاصل نہیں ہوا؛ لیکن بخاری شریف کے افتتاحی واختتامی درس میں شرکت کی بار بار نوبت آئی اور ان کے خطبات میں بھی ضمنی طور پر بعض احادیث کی دلنواز اور اچھوتی تشریح سننے کا موقع ملا، وہ عام درسی اور علمی وفقہی مباحث سے ہٹ کر بڑے اہم نکات اخذ کرتے اور تربیتی پہلو سے حدیث کے بڑے اہم فوائد پیش کرتے تھے، مثلاً حجۃ الوداع کے موقع سے جب آپ ﷺ نے زمزم پینا چاہا تو حضرت عباسؓ نے عرض کیا: یہاں پانی جھوٹا ہے، اس میں مختلف لوگ ہاتھ ڈالتے ہیں، میں آپ کے لئے صاف پانی کا مٹکا منگواتا ہوں؛ لیکن آپ ﷺ نے اسی مٹکے سے پانی پینے کو ترجیح دی، جس سے سبھی حضرات پی رہے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ علماء کو اجتماعی زندگی میں سبھوں کے ساتھ مساویانہ طریقہ پر زندگی گزارنی چاہئے، اسی طرح ایک بار کلید کعبہ کا واقعہ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ حضور ﷺ نے عثمان شیبی سے کلید حاصل کی اور پھر انھیں کو واپس لوٹائی، اس سے معلوم ہوا کہ اجتماعی کاموں میں اگر کسی ذمہ دار سے کوئی چیز لی جائے تو حتی المقدور دوبارہ اسی کو ذمہ داری سونپنے کی کوشش کی جائے، اس طرح کے بہت سے افادات ہیں، جو ان سے سننے کو ملتے تھے۔

باکمال استاذ کی شان ہے کہ اس کے شاگردوں کے دل میں اس کی محبت کا نقش بیٹھ جائے، اور یہ بات اسی وقت پیدا ہوتی ہے، جب استاذ علمی لیاقت کا حامل بھی ہو اور اخلاقی اقدار کے اعتبار سے بھی اس کا پایہ بلند ہو، اس حقیر نے مفتی صاحب کے تلامذہ کو دیکھا ہے کہ وہ اُن سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں اور غائبانہ بھی ان کا اسی طرح احترام کرتے ہیں جیسے ان کے سامنے، ہندوستان کے جنوبی علاقوں خاص کر کرناٹک، ٹمل ناڈو، کیرالا، آندھرا پردیش اور تلنگانہ میں کم ایسے مدارس ہوں گے، جہاں آپ کے دامنِ فیض سے وابستہ علماء نہ ہوں؛ لیکن اس کے علاوہ پورے ہندوستان، سری لنکا اور ملیشیا وغیرہ میں بھی آپ کے تلامذہ اور مستفیدین کی بڑی تعداد ہے۔

مفتی صاحب بڑے اعلیٰ درجہ کے خطیب تھے، ان کے خطاب میں معنویت بھی ہوتی تھی، الفاظ وتعبیرات کا حسن بھی ہوتا تھا، تقریر میں جوش، نشیب وفراز، شوروغوغا، مناظرانہ بحث وتمحیص نہیں ہوتی تھی، نہ آواز میں ایسی کرختگی کہ مقرر کی رگیں پھول جائیں، اور نہ انداز ایسا سپاٹ کہ سننے والے کو کوئی کشش نہ ہو، لگتا تھا کہ دریا ہے، جو سبک خرامی کے ساتھ بہہ رہا ہے اور دل ودماغ کی زمین کو سیراب کرتا جارہا ہے؛ اسی لئے آپ کا خطاب ''از دل خیزد بر دل ویزد'' کا مصداق تھا، میں نے وقار وٹھہراؤ کے ساتھ تقریر کرنے کے باوجود آواز میں ایسی مٹھاس، الفاظ پر ایسا قابو اور لب ولہجہ میں ایسی کشش حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ کے علاوہ کہیں اور نہیں دیکھی، اسی لئے راقم الحروف سے کسی اہم اجلاس کے لئے مقررین کے سلسلہ میں مشورہ کیا جاتا تو ضرور مفتی صاحب کا نام پیش کرتا، مسلم پرسنل لا بورڈ، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اور ملی کونسل کے اجلاس عام میں ایک اہم اور خصوصی مقرر کی حیثیت سے آپ کا نام ضرور شامل ہوتا، ان کا ہر خطاب اس لائق ہوتا کہ محفوظ کیا جائے، خطبات بنگلور کا جو سلسلہ شروع ہوا، اس میں پہلا خطبہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ نے دیا، اس خطبہ سے پہلے مفتی صاحب نے قاضی صاحب کا تعارف کرایا، یہ برجستہ تعارف ایسا خوبصورت ہے، جیسے ہیرے جواہرات سے جڑا ہوا تخت طاؤس۔

مفتی صاحب کا ہر خطاب اس لائق ہوتا تھا کہ اسے صفحۂ قرطاس پر لایا جائے؛ تا کہ آنے والی نسل بھی اس سے استفادہ کر سکے؛ لیکن شاید اس کا کما حقہ اہتمام نہ ہو سکا؛ لیکن جو تھوڑا بہت محفوظ کیا گیا ہے، وہ بھی کچھ کم نہیں ہے، مثلاً ایک موقع پر فرماتے ہیں :

> بزرگانِ محترم ! ہمارا اور آپ کا دین محبتوں پر قائم ہے، مجھے اخیر میں یہ کہہ کر بات ختم کرنے کی اجازت دیجئے، یہ دین دینِ محبت ہے، دینِ اُلفت ہے، دینِ عشق ومحبت ہے، اس دین کی بنیاد محبتوں پر رکھی گئی ہے، ایمان پنپتا ہے محبت کی فضاؤں میں، اختلافات میں، جھگڑوں میں، عداوتوں میں، دشمنیوں میں، تعاند میں، تحاسد میں ایمان پنپتا نہیں، ایمان کے لئے محبت کی فضا رکھنا ضروری ہے، اس کے بغیر ایمان نہیں پنپتا، نہیں ترقی کرتا، نہیں پروان چڑھتا! اور نہ ہی اس کے اندر قوت پیدا ہوتی ہے، یہ میں نہیں کہتا ہوں......رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں، ضرورت ہے اس کو پیدا کرنے کی، اللہ کی محبت پیدا کیجئے! اللہ کے پیغمبر ﷺ کی محبت کو پیدا کیجئے! اور اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے ماننے والوں کی محبت کو پیدا کیجئے! آپس میں

اختلافات کوختم کیجئے ! افتراق اور انتشار کو دُور کیجئے ! مضبوط رسی کو تھامئے اوراختلافات کودُور کیجئے !محبتوں کو پیدا کیجئے توایمان میں ترقی ہوگی......!

اسلام ایک مکمل دین ہے، ایمان کا تقاضہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کے تمام مسائل میں اپنے دین سے روشنی حاصل کریں، دوسری طرف دیکھنے کی کوشش نہ کریں، مفتی صاحب نے خطاب میں اس بات کا کس خوبصورتی کے ساتھ ذکرفرمایاہے :

آج میں نے تمہارے دین کومکمل کردیا!اپنی نعمت تمام کردی!تمہارے نظام حیات اور دستورِ زندگی کے طور پر اسلام کو پسند کیا!......کامل مکمل دین، ایسا دین جس میں نقص نہیں،کوئی ضعف نہیں،کمی نہیں، اضمحلال نہیں، اللہ نے ایسا دین ہمیں دیا،عطا فرمایا......!اور ہم زبان سے بھی ظاہر نہیں کرتے !اللہ ہماری حفاظت فرمائے !کبھی کبھی ایسا طرزِعمل اختیار کرتے ہیں جس سے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ شاید ہم اپنے دین کے کامل ہونے پر یقین نہیں رکھتے اورمحتاجانہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں، ایسی محتاجی، ایسی کاسہ لیسی، ایسا منگتاپن ہمارے اندر آتا چلا گیا ہے کہ اللہ کے آخری پیغمبرﷺ نے ہمیں بتادیا کہ پیدا ہونے سے موت تک یہ کرنا ہے، یہ کرنا ہےاوراس منزل سے اس طرح گذرنا ہے، نہ صرف یہ کہ آپﷺ نے بتایا؛ بلکہ دست مبارک سے تھام کر ہر مشکل مرحلہ سے گذارا؛ لیکن ہم اس کے باوجود دوسروں کی طرف دیکھتے ہیں، دوسروں کالباس پسند آتا ہے، دوسروں کی وضع قطع، دوسروں کی بول چال ہمیں پسند آتی ہے اور ہم سوچتے ہیں کہ اگر یہ حکم ہمارے دین میں آیا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا!

علم کی اہمیت اورعلم اور دین کے باہمی رشتہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں :

بزرگانِ محترم ! ہمارا دین، میں نے عرض کیا،قرأت پر، تلاوت پر، پڑھنے پڑھانے پر، سیکھنے سکھانے پر، قرطاس وقلم پر مبنی ہے،اس میں پڑھنا پڑھانا، سیکھنا سکھانا،لکھنا لکھانا،تصنیف وتالیف، مدرسے اور مکاتب یہ ہمارے دین کی بنیادوں میں ہے،اس لئے لکھنے والے اللہ کے نیک بندے آج بھی لکھ رہے ہیں،ایک ایک موضوع پر کتاب لکھ رہے ہیں،بیس بیس جلدیں،تیس تیس وولیوم (Volume)اس

طرح کتب خانے بھرے ہوئے ہیں ،بعض حضرات کو اشتباہ ہوتا ہے کہ یہ کتابیں کہاں سے آگئیں؟ اتنے سارے مجلدات کہاں سے آگئے؟ یہ سب کہاں تھے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ؟ جی نہیں ! اللہ نے فرمایا: ''عَلَّمَ بِالْقَلَمْ ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ '' اللہ نے قلم جیسی بے جان اور بے روح شئ کو، کہ قلم خود حرکت نہیں کرسکتا، دست انسانی جب تک اس کے ساتھ لگتا نہیں ، وہ چل نہیں سکتا؛ لیکن اسی بے جان اور بے روح قلم کو اللہ نے تعلیم انسانی کا ذریعہ بنا دیا، انسان کو وہ سب کچھ سکھا دیا جو نہیں جانتا تھا:''عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ '' وہ سب اللہ نے سکھا دیا۔

مفتی صاحب ہمیشہ اپنے خطاب میں اعتدال، تحمل اختلاف اور اتحاد کی دعوت دیتے تھے اور اس بات کو بڑی عمدگی سے سمجھاتے تھے ،شریعت میں خود اختلاف رائے کی گنجائش رکھی گئی ہے اور صحابہ کے دور میں بھی بعض مسائل میں رائے کا اختلاف پایا جاتا تھا؛لیکن اس کو کسی نے بُرا نہیں سمجھا؛ چنانچہ اختلاف برداشت کرنے اور باہمی عداوت ودشمنی سے بچتے ہوئے اجتماعیت پیدا کرنے کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں :

بزرگانِ محترم ! ہم کسی غرضِ دنیوی کے تحت آپس میں دشمنی پیدا کرلیں تو کچھ نہ کچھ دنیوی فائدہ تو بہر حال ہمیں ہوگا ہی؛ حالاں کہ اس کی بھی اجازت نہیں ،عداوتوں کی اجازت نہیں ؛لیکن دینی اعتبار سے ہم نے کوئی چیز اپنے خیال کے اعتبار سے صحیح سمجھی اور دوسرے نے دوسری چیز کو صحیح سمجھا،تو ہم محض اس بنیاد پر کہ میں نے جو چیز صحیح سمجھی ہے اور جس کو میں نے اختیار کیا ہے،جس شخص نے اختیار نہیں کیا، میں اس کا دشمن ہوجاؤں عدو ہوجاؤں اور باہمی عداوت کی کیفیتیں ہمارے اندر پیدا ہونے لگیں ، اسلام اس کا قطعاً متحمل نہیں ہے، ہمارا ایمان اسے چاہتا ہی نہیں ، اسے برداشت کرتا ہی نہیں ؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم پہلے تھے دشمن ایک دوسرے کے، اللہ کا احسان ہوا کہ تم بھائی بھائی بن گئے .....تو اس کے بعد اب پھر یہ کیفیت پیدا ہوجائے ،تو اس کی کہاں گنجائش!

مفتی صاحب اپنے خطاب میں ہمیشہ دُکھتی رَگ پر انگلی رکھا کرتے تھے اور جو ضرورت ہوتی ،اس کی تلقین فرماتے تھے، جیسے نظام مکاتب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں :

امر واقعہ یہ ہے کہ مکاتب ہمارے دین کی بنیادوں میں سے ہیں اور معاشرے میں ہمارے اگر دین کو باقی رہنا ہے، اسلام کو قائم رہنا ہے اور ہماری آئندہ نسلوں کو اسلام پر چلتے ہوئے زندگی گزارنی ہے تو مکاتبِ دینیہ کا نظام بالکل ضروری ہے اور لازمی ہے، سب سے پہلے یہ چیز ہونی چاہئے اور اس کو ہم اور آپ اچھی طرح سے سمجھ سکتے ہیں، اس ہدایت کی روشنی میں جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہے اور عمل کر کے بھی دکھایا ہے، بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو آپ کے علم میں ہے اور ہر مسلمان جانتا ہے کہ بچے کے دائیں کان میں اذان دی جاتی ہے اور بائیں کان میں اقامت کہی جاتی ہے، آپ سوچئے ایک چھوٹا سا بچہ، معصوم بچہ، آنکھیں بھی صحیح طریقے سے نہیں کھولتا، جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اس کے اندر وہ صلاحیت نہیں، ایسے نومولود، معصوم بچے کے کانوں میں اذان اور اقامت کی آواز ڈالی جاتی ہے، پہنچائی جاتی ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم ہے، کیا مطلب ہے اس کا؟ مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے بچے کے لوحِ قلب پر جو چیز لکھی جائے گی، جو حروف ثبت کئے جائیں گے، جو بات اس کے دل میں بٹھائی جائے گی وہ اللہ کی کبریائی، خدا کی وحدانیت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت، نماز کی دعوت، فلاح اور کامیابی کی طرف بلانا، یہ چیزیں سب سے پہلے اس کے دل کی تختی پر لکھی جانی چاہئیں......!

مفتی صاحب کا ہر خطاب نہ صرف تعبیر و بیان کے اعتبار سے خوبصورت ہوتا؛ بلکہ ایک واضح پیغام پر مبنی ہوتا، مفتی صاحب نے لکھنے پر کم توجہ دی؛ لیکن اگر آپ لوح وقلم کی دنیا میں فروکش ہوتے تو اپنے زمانہ کے بڑے مصنفین اور نثر نگاروں میں ہوتے، ایک زمانہ میں دارالعلوم سبیل الرشاد سے ''سلسبیل'' نکلا کرتا تھا، جو غالباً سہ ماہی تھا، اس میں آپ ''سرچشمہ'' کے عنوان سے اداریہ'' آبِ حیات'' کے عنوان سے درس قرآن اور'' جامِ کوثر'' کے نام سے درس حدیث لکھا کرتے تھے، غور کیجئے خود ان عنوانات میں کیسی ندرت اور کس بلا کا حسن ہے؟

ایک حدیث ہے: سات لوگوں کو قیامت کے دن عرش الٰہی کا سایہ حاصل ہوگا، جس میں ایک وہ ہے، جس کا دل مسجد میں اٹکا رہتا ہو، اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

مالک روزِ جزا کی طرف سے گویا اعلان کیا جائے گا: اے گوشہ نشیں بندے! ایک وسیع وعریض دنیا میں ہم نے تمہیں بھیجا تھا، جس کی ہر چیز اپنی کشش رکھتی تھی، فلک

بوس پہاڑ، بے کراں سمندر، بہتے ہوئے دریا، نیلگوں جھیلیں، شاداب کھیتیاں، سرسبز وشاداب کھلے میدان، جہاں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتی تھیں، تجارت کے سرگرم مراکز جہاں سیم وزر کی بارش ہوتی تھی؛ لیکن کہیں تمہارا جی نہیں لگتا تھا، اگر تمہارا جی لگتا تھا تو ہمارے گھر کی پُرسکون فضا میں، تم انسانی ضرورتوں، تقاضوں اور خود ہمارے احکام کے تحت مجبور ہوکر باہر جاتے تھے؛ لیکن تمہارا دل مسجد میں لگا رہتا تھا، تمہارے لئے دنیا کی کسی شئے میں ایسی کشش نہیں تھی کہ وہ تمہارے قلب کو اپنی طرف مائل کرسکتی، تم چاہتے تھے کہ ہمیشہ اس گھر میں رہوں جس کی نسبت ہماری طرف تھی، جہاں ہماری رحمتیں نازل ہوتی تھیں، آج کے اس ہولناک دن بھی ہم جانتے ہیں کہ تمہیں اطمینان ایسی ہی جگہ رہنے سے حاصل ہوگا جس کی نسبت ہماری طرف ہو؛ چنانچہ ہم تمہیں اپنے عرش کے سائے میں جگہ دے رہے ہیں!

صحابہ کے ایثار کے ایک واقعہ کی کیسی خوبصورت تصویر کھینچتے ہیں :

......عسرت وتنگ دستی کا دور ہے، جانے کتنے جتن کے بعد چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کے لئے تھوڑا سا کھانا تیار ہوسکا ہے، ایسے عالم میں صاحبِ خانہ رات کے کھانے پر ایک مہمان کے ساتھ آتے ہیں اور بیوی سے کہتے ہیں کہ بچوں کو بہلا پھسلا کر سلا دو! مہمان نوازی ضروری ہے، بچوں کے سوجانے کے بعد مہمان کو لے کر دسترخوان پر بیٹھتے ہیں، بیوی حسبِ ہدایت بتی درست کرنے کے بہانے چراغ گُل کردیتی ہیں، اندھیرے ہی میں کھانا شروع ہوتا ہے، مہمان یہ سمجھتے ہوئے کہ میزبان بھی کھانے میں شریک ہیں، اطمینان کے ساتھ کھانے سے فارغ ہوجاتے ہیں اور وہ رات، دونوں میاں بیوی اور معصوم بچے فاقے سے گذار دیتے ہیں، قرآن مجید کی آیت اُترتی ہے: ''وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ'' (اور ترجیح دیتے ہیں اپنی جانوں پر اگر ان پر فاقہ ہی ہو)۔

'سلسبیل' کے اداریوں میں معنی خیز، ولولہ انگیز اور ادبی چاشنی سے بھرپور دل آویز بہت سے مرقعے موجود ہیں، ایک اداریہ میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی وفات پر آپ نے ایسا خراج عقیدت پیش کیا ہے، جس کے ہر ہر لفظ سے محبت کی خوشبو آتی ہے، اس کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ کیا جاسکتا ہے :

فروغِ بزم ! آپ کیا تشریف لے گئے کہ پوری محفل بے نور اور بے رونق ہوگئی، دانش وحکمت کا قصر درخشاں شب گزیدہ ہے اور اندھیروں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، وہ عزت وآبرو داستانِ پارینہ بن گئی جو آپ کی رہین منت تھی، عظمت و وقار اور تفوق وبرتری کا وہ شاندار محل زمیں بوس ہوگیا، جو آپ کے دم قدم سے سرفراز تھا، آپ کی شان تو وہ تھی کہ جب آپ کسی علاقے کا سفر فرماتے تو یوں محسوس ہوتا، جیسے کوئی فرماں روائے وقت اپنی قلمرو کا دورہ کررہا ہے اور آپ کے بعد اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ: ''پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں!'' علوم ومعارف کا لہلہاتا چمن خزاں رسیدہ ہے اور اپنے بوڑھے مالی کو رورہا ہے، خوبصورت روشیں پامال اور دلکش کیاریاں خاک بسر ہیں، پتہ پتہ سوگوار اور ڈالی ڈالی بے قرار ہے، ہر غنچہ گریاں اور ہر پھول ماتم کناں ہے، گوشے گوشے سے سسکیوں کی آوازیں آرہی ہیں، آہوں کا دھواں اُٹھ رہا ہے اور پوری فضا پر غبارِ اَلم چھاتا چلا جارہا ہے۔

مفتی صاحب کی زیادہ توجہ درس وانتظام پر تھی، اس لئے لکھنے پر کم توجہ دی؛ لیکن چند مقالات جو سلسبیل کے واسطہ سے شائع ہوئے ہیں، وہ بھی خوب بلکہ خوب تر ہیں، ان میں ایک مقالہ ''اعداد قرآنی'' پر ہے، جس میں قرآن میں بیان کئے گئے اعداد اور جس چیز کی تعداد بیان کی گئی ہے، اس کی معنویت پر روشنی ڈالی گئی ہے، یہ قرآن کریم کی ایک نئی جہت کا مطالعہ ہے اور خوب ہے، اسی طرح ''علم ریاضی اور شمس وقمر کی رفتار'' پر آپ کا مضمون بہت خوب ہے اور اس میں بعض اہم سوالات کے جواب دیئے گئے ہیں، غرض کہ مفتی صاحب نے کم لکھا ہے؛ لیکن جو کچھ لکھا ہے، خوب لکھا ہے۔

مفتی صاحب کے نانا علامہ ضیاء امانی بڑے عالم بھی تھے اور بڑے ادیب بھی، شاید نانیہال ہی کی طرف سے اللہ نے آپ کو خصوصی ادبی ذوق سے نوازا تھا، ذوق تو نثر ونظم دونوں کا تھا اور خوب تھا؛ لیکن نسبتاً اشعار میں اس کے اظہار کی زیادہ نوبت آئی، مفتی صاحب نے مختلف صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے، نعتیں بھی کہیں ہیں، نظمیں بھی اور غزلیں بھی، آپ کی نعتیں عشق ومحبت کی حرارت میں ڈوبی ہوئی ہیں اور اس کے لفظ لفظ سے عشق نبوی کی خوشبو پھوٹتی ہے، آپ نے نعت کے روایتی اشعار سے ہٹ کر منفرد لب ولہجہ میں اشعار کہے ہیں، جو یقیناً جناب رسالت مآب ﷺ سے محبت وگرویدگی کا نتیجہ ہے :

عقیدت آپؐ سے ہے ، احترام آپؐ کا ہے
حضورؐ ! یہ دل خستہ غلام آپؐ کا ہے

دعائے خیر ، تمنائے نیک ، شر کے عوض
یہ ظالموں سے حسیں انتقام آپؐ کا ہے
تکلم آپؐ کا قانونِ شرع ہے لاریب
سکوت بھی تو شریعت نظام آپؐ کا ہے

یہ ایک طویل نعت کے چند اشعار ہیں، آپ کی نعتوں میں بہت سی تلمیحات اور قرآنی آیات کی طرف اشارہ ملتا ہے، زندگی کیا ہے؟ سکھ و آرام کیا ہے؟ کس کو علم کہتے ہیں اور کس کو جہل؟ سربلندی کس چیز کا نام ہے؟ اس کو شاعر کی زبان سے سنیے :

آتش عشق نبیؐ میں جل کے سکھ پانے کا نام
زندگی ہے آپؐ پر قربان ہوجانے کا نام
جس کو دنیا علم کہتی ہے ، وہ جہل محض ہے
علم تو ہے آپؐ کے ارشاد فرمانے کا نام
سرخ رُوئی ، خاک پا چہرے پہ ملنے کا صلہ
سربلندی آپؐ کے قدموں پہ جھک جانے کا نام
شمعِ بزمِ کن فکاں کے نعت خوانوں میں تو اب
آرہا ہے مرحبا ! اشرف سے پروانے کا نام

بارگاہِ نبوی کے ثنا خواں کو اپنے محبوب کی ہر چیز سے خوشبو آتی ہے :

وہ سرزمین مدینہ ، وہ جنت فردوس
ہے جاں فزا در و دیوار و بام کی خوشبو
وہ صبح عطر بداماں وہ شامِ گُل افشاں
بسی ہے دل میں اسی صبح و شام کی خوشبو
یہاں رُکے ہیں شہِ دیں ، ادھر سے گذرے ہیں
بتا رہی ہے ہمیں گام گام کی خوشبو

مفتی صاحب کی متعدد غزلیں ''اوجِ شرف'' میں شامل ہیں، اس میں بعض بحریں بہت چھوٹی ہیں اور کم سے کم الفاظ کے اندر معانی کا ایک سمندر چھپا ہوا ہے :

خود ہی مٹ جاؤں گا نقش بر آب ہوں
باڑھ کانٹوں کی ہے باغ شاداب ہوں
ساغرِ امن کا بادۂ ناب ہوں

اورایک دواشعار بحرطویل کے بھی ملاحظہ کیجئے :

محبت کے اونچے پہاڑوں کی روشن چٹانوں کی بستی میں لوگوں کو بھیجو !
تنفر کے تاریک غاروں کی کالی بلاؤں میں کب تک پھنساتے رہو گے
تمہیں پیار کے روح پرورگلستاں کے شاداب پھولوں سے کیوں دشمنی ہے؟
عداوت کے پرہول مرگھٹ میں نفرت کی یہ آگ کب تک جلاتے رہو گے؟
ذرا چلنے دو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ذرا ہونے دو ہلکی ہلکی پھواریں
یہ آندھی، یہ صرصر، یہ لو، یہ بگولے، یہ طوفان کب تک اُٹھاتے رہو گے

آپ کی غزلیں زبان و بیان کی رعنائی کے ساتھ گہری معنویت کی حامل ہے، کوئی غزل شروع کریں تو مکمل کئے بغیر طبیعت سیر نہیں ہوتی، مختلف غزلوں میں سے چند اشعار پیش خدمت ہیں :

آسماں ! جس نے نہ سمجھا تھا کسی قابل مجھے
کر رہا ہے حوصلہ مندوں میں اب شامل مجھے
ظلم کے گرداب میں کشتی پھنسی تو کیا ہوا
وہ نظر آتا ہے ہمدم ! امن کا ساحل مجھے

●

بڑھ کے لیتی ہے اسے منزل مقصود اپنی
جو مسافر کہ سمجھتا ہے سفر باقی ہے
ان سے کب نظریں ملی تھیں ، یہ مجھے یاد نہیں
آج تک اس کا سوز و اثر باقی ہے

●

بے سوز قلب ، درد سے خالی جگر ملے
جتنے یہاں ملے مجھے ، ننگ بشر ملے
اوجِ بشر کو دیکھ کے کہنے لگا فلک
اچھا ہوا حیات کے دن مختصر ملے

●

ذرے ذرے سے آشکار ہے وہ
اور پھر بھی وہی ہے اب تک راز

●

تمہاری رہ گذر ہے اور میں ہوں
رہ بے راہبر ہے اور میں ہوں
اُمیدوں کی سحر ہے اور میں ہوں
حیات مختصر ہے اور میں ہوں

●

میری ہر بات داد سے محروم
ان کا ہر وعدہ ، وعدۂ مرحوم

مفتی صاحب کے اشعار میں کہیں کہیں لہجہ میر کی جھلک بھی نظر آتی ہے، جیسے ان اشعار کو دیکھا جائے :

ہم تو پیتے ہیں چشم مست کی مئے
یہ کہاں ساغر و سبو لو ہو
جان دے دیں گے اس پہ ہم اشرف !
تم جو اُردو کا اب لہو ، لو ہو

مفتی صاحب نے آزاد شاعری میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور خوب کی ہے، کئی نظمیں اور غزلیں اسی اُسلوب میں کہی گئی ہیں، اس طرح کی متعدد نظمیں مجموعہ میں شامل ہیں، مولانا عبدالوہاب صاحب بانی باقیات الصالحات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں :

شمس علمائے دہر، اوستاد زماں
پیکر اتقاء، شان قدوسیاں
حق نگر، حق بیاں، نکتہ رس، دوربیں
محفل علم وحکمت کے مسند نشیں
بزم آرائے تجدید دین متیں
نازشِ شش جہات
ذات والا صفات
عبدِ وہاب! اے بانی باقیات!

جو لوگ علم وتحقیق اور تصنیف و تدریس کے شہسوار ہوتے ہیں ، انتظام و انصرام کے کاموں سے ان کو مناسبت نہیں ہوتی ؛لیکن آپ جیسے اعلیٰ درجہ کے خطیب ، کہنہ مشق قلم کار اور میدانِ شعروسخن کے شہسوار تھے، ویسے ہی نظم ونسق کی بھی اعلیٰ صلاحیت رکھتے تھے، دارالعلوم سبیل الرشاد کا اپنے والد ماجد کی زندگی ہی میں سارا انتظام آپ کے حوالہ کردیا گیا تھا، ان کی وفات کے بعد دارالعلوم آپ کے زیر انتظام اسی طرح پوری آب وتاب کے ساتھ چلتا؛ بلکہ آگے بڑھتا رہا، آپ کے دور اہتمام میں بہت ساری عمارتیں تعمیر کی گئیں، درسگاہ بلڈنگ، کتب خانہ، ایوانِ سعود (کانفرنس ہال)، ڈائننگ ہال، انتظامی بلڈنگ، مسجد کی توسیع وغیرہ، ہر عمارت کا جداگانہ طرز تعمیر ہے، مگر ہر ایک پُرشکوہ، دیدہ زیب، خوبصورت اور مضبوط۔

اسی طرح آپ کے عہد اہتمام میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، آل انڈیا ملی کونسل کے متعدد اجلاس، سبیل الرشاد کا پچاس سالہ جشن، تربیت قضا اور تفہیم شریعت ورکشاپ اور بہت سارے پروگرام ہوئے، یہ سارے پروگرام حسن انتظام اور خوش ذوقی کا شاہکار تھے، مفتی صاحب کو جو چیز دوسرے ذمہ داروں سے ممتاز کرتی ہے، وہ ہے خوش سلیقگی، تعمیر ہو یا پروگرام، مہمانوں کا استقبال ہو یا ان کو رخصت کرنا، ہر جگہ اور ہر عمل میں خوش ذوقی اور خوش اخلاقی قدم قدم پر نمایاں ہوتی، خود مفتی صاحب کا رہن سہن، دفتری نشست گاہ، ملاقات گاہ، سبھی تہذیب وشائستگی کا بہترین نمونہ تھی، آپ خود بھی اس پر عامل تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کیا کرتے تھے؛ چنانچہ اپنے ایک خطاب میں فرماتے ہیں :

> بزرگانِ محترم ! ہمارا دین جو اسلام ہے، بہت ہی سلیقوں اور قرینوں کا دین ہے، ہر بات میں سلیقہ، ہر کام میں قرینہ، رسول اللہ ﷺ نے ہمیں جو دین مرحمت فرمایا اور اس کے اندر جو آداب ہیں، اُصول ہیں، ضوابط ہیں، کلیات ہیں، ان کی وضاحت فرمائی، ان کو دیکھئے تو لگے گا کہ اسلام ایک ایسا مزین، مہذب، خوبصورت اور حسین وجمیل دین ہے، جس کے اندر کہیں بھی کسی طرح کا کوئی نقص، کوئی عیب، کوئی کمزوری نہیں پائی جاتی۔

مفتی صاحب اپنے تمام تر علمی کمالات ، وسیع تعلقات اور دینی اداروں سے لے کر حکومتوں تک گہرے اثرات کے باوجود انکسار وتواضع کا پیکر تھے، بڑوں سے ہی نہیں؛ بلکہ چھوٹوں کے ساتھ بھی اتنے اکرام کا معاملہ کرتے کہ اگر کوئی کم فہم آدمی ہو تو غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے، مجھے خود ان کی کسر نفسی کا بارہا تجربہ ہوا، ایک بار سبیل الرشاد کے پروگرام میں حاضر ہوا، ایئرپورٹ پر حضرت مولانا سید مصطفیٰ رفاعی صاحب بعض رفقاء کے ساتھ استقبال کے لئے

موجود تھے ؛ لیکن جب میں آگے بڑھا تو لوگوں نے بتایا کہ مفتی صاحب بنفس نفیس آپ کے استقبال کے لئے تشریف لائے ہیں اور کار میں بیٹھے ہوئے ہیں ، بڑی شرمندگی ہوئی ، مفتی صاحب سے اس کا اظہار بھی کیا گیا ، مفتی صاحب نے فرمایا : آپ ہمارے مہمان ہیں ؛ اس لئے مجھے آنا ہی چاہئے تھا ، ایک اور موقع پر میں بنگلور کے کسی اور پروگرام سے حیدرآباد واپس آرہا تھا ، مفتی صاحب نے ملاقات کے دوران نظام سفر دریافت کیا اور میں نے اس کو ایک رسمی گفتگو سمجھا ، مگر جب ٹرین کنٹونمنٹ اسٹیشن پر رُکی ، جہاں سے سبیل الرشاد قریب ہے ، تو اچانک دیکھا کہ مفتی صاحب خود توشہ لے کر آئے ہوئے ہیں ، شرمسار بھی ہوا اور عبرت بھی ہوئی کہ ہمارے بزرگوں میں کیسی خورد نوازی ہے !

مفتی صاحب اپنے والد ماجد کے علاوہ جن بزرگوں سے زیادہ متاثر تھے ، ان میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ، شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ اور حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہے ، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ سے غیر معمولی ذہنی ہم آہنگی تھی ؛ چنانچہ مفتی صاحب نے دبئی کے ایک خطاب میں فرمایا :

> برصغیر میں ، ہندوستان میں بہت سے علماء اور اکابر رہے ہیں اور ہر ایک کا ایک مقام ہے اور بہت سوں سے ہماری عقیدت اور محبت و ارادت کا تعلق بھی رہا ہے ؛ لیکن واقعہ یہ ہے کہ پہلی ملاقات میں جس طرح خیالات ، جذبات اور احساسات میں یکسانی کا احساس ہوا قاضی صاحب کو میرے ساتھ ، یا مجھے قاضی صاحب کے ساتھ ، یہ بھی ایک عجیب وغریب بات ہے ، جو خیال دل میں آیا ، جو بات دل میں آئی ، وہ قاضی صاحب سے عرض کی تو قاضی صاحب نے اس کی تائید فرمائی ، یا قاضی صاحب نے جو فرمایا ، ایسا لگا جیسے وہ ہمارے دل کی بات کہہ رہے ہیں ۔

راقم الحروف نے قاضی صاحب کو دیکھا کہ جب کبھی کسی تنظیم کی تشکیل کرتے ، یا کسی ادارہ کی داغ بیل ڈالتے تو مفتی صاحب کا نام اس میں ضرور شامل کرتے ، اسلامک فقہ اکیڈمی ہو یا ملی کونسل ، اس کی کوئی میٹنگ یا کوئی پروگرام مفتی صاحب کے بغیر مکمل نہیں ہوتا ، امارت شرعیہ یا بہار کا کوئی اہم پروگرام ہوتا تو بحیثیت مقرر مفتی صاحب کو مدعو کرنے کی تلقین کرتے ، خود مفتی صاحب کا حال یہ تھا کہ وہ تقریباً ہر سال ہی کسی نہ کسی بہانے قاضی صاحبؒ کو بنگلور یا میسور میں خطاب کے لئے بلاتے ، متعدد بار سبیل الرشاد کے سالانہ جلسے میں مدعو کیا ، قاضی صاحب کو بھی اس ادارہ سے ایسا تعلق تھا کہ عدیم الفرصتی کے باوجود جب بھی یہاں تشریف لاتے ، کئی کئی دن مقیم رہتے ، ایک دن کہنے

لگے: مجھے ہندوستان بھر میں حضرت مولانا ابوالسعود صاحبؒ پر بہت رشک آتا ہے کہ وہ خود بڑے عالم ہیں اور ان کے چاروں صاحبزادے نہ صرف عالم ہیں بلکہ اچھے عالم ہیں، پھر مفتی صاحب کا خاص طور پر ذکر کیا اور ان کی علمی لیاقت اور تواضع کا دیر تک ذکر کرتے رہے۔

اس حقیر نے فراغت کے بعد ہی سے بہت دفعہ حضرت مفتی صاحبؒ کا ذکر خیر سنا، مسلم پرسنل لا بورڈ کے پروگراموں میں دُور دُور سے دیکھا، وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ اس طرح رہتے تھے، جیسے عام قسم کا خادم، تواضع کی وجہ سے ان کو پہچاننا دشوار ہوتا تھا؛ لیکن قریبی ارتباط اس وقت شروع ہوا جب اسلامک فقہ اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا، پھر ایسا ہوا کہ مفتی صاحب کے مشورہ سے بنگلور کے کچھ احباب نے سیرت نبوی پر ''خطبات بنگلور'' شروع کیا اور پہلا خطبہ حضرت قاضی صاحبؒ کا ہوا، یہ انتخاب بھی بظاہر مفتی صاحب ہی کا مشورہ تھا، اس موقع سے آپ نے افتتاحی کلمات کہے جو خوب بلکہ خوب تر ہیں، تعارف کے یہ الفاظ ہیرے اور جواہرات سے بھی زیادہ خوبصورت تعبیرات پر مشتمل ہیں، اور اس پر مفتی صاحب کی خداداد آواز مستزاد تھی، جس میں کھنک تھی، وقار تھا اور جو کانوں میں رس گھولتی تھی، میں نے ان کلمات کو ٹیپ ریکارڈ پر سنا، ایک دو سال کے بعد وقفہ سے 'خطبات بنگلور' کا دوسرا دور منعقد ہوا، مفتی صاحب ہی کے مشورہ سے اس بار قرعۂ فال اس حقیر کے نام نکلا، اس موقع پر ایک ہفتہ بنگلور میں قیام رہا اور مفتی صاحب کو نسبتاً قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، آپ نے مدرسہ کے علاوہ ذاتی طور پر اپنے دولت خانہ پر بھی مدعو کیا، اور بڑی حوصلہ افزائی فرمائی، پانچ روزہ پروگرام کے درمیان جو بعد مغرب ہوا کرتا تھا، روزانہ شروع سے اخیر تک تشریف فرما ہوتے اور میرا حوصلہ بڑھاتے۔

قاضی صاحب کی وفات کے بعد سبیل الرشاد کا جو سالانہ جلسہ منعقد ہوا، اس میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مجھے مدعو فرمایا، اپنے مزاج کے مطابق بڑا اکرام کرتے رہے، میں نے سبیل الرشاد کے مزاج و مسلک اور موجودہ حالات میں اس کی معنویت پر خطاب کیا، مفتی صاحب نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور منھ بھر بھر کر تعریف کی، اس میں ان کی خورد نوازی کا بھی دخل تھا اور اس بات کا بھی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے ضرورت کے مطابق باتیں کہلوا دیں، مفتی صاحب کی شفقت کا حال یہ تھا کہ سبیل الرشاد میں ہونے والے اکثر اہم پروگراموں میں بلا استحقاق اس حقیر کو طلب فرماتے تھے اور راقم ان کے حکم کی تعمیل میں قلبی سکون محسوس کرتا تھا۔

حضرت قاضی صاحبؒ کی وفات کے بعد جب اکیڈمی کی تشکیل نو ہوئی تو آپ اس کے نائب صدر منتخب کئے گئے، اس کے بعد قربت اور بڑھ گئی، اکیڈمی کی میٹنگوں میں ان کے مشورے بڑے اہم ہوتے تھے اور وہ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ اکیڈمی کی فکر اور اس کے فیصلے سلف صالحین کے متوارث منہج سے ہٹنے نہ پائیں، اکیڈمی کے

سیمناروں میں بھی بڑی پابندی سے شرکت فرماتے اور کسی نہ کسی نشست کی صدارت ان سے ضرور متعلق ہوتی ، ایسے موقع پر وہ بہت ہی نپے تلے صدارتی کلمات کہتے اور اس سے ہٹ کر بھی زیر بحث مسائل میں حصہ لیتے ، ان کی گفتگو کو تمام شرکاء توجہ سے سنتے اور خاص اہمیت دیتے ، اکیڈمی میں قاضی صاحب کے بعد تجاویز پر نظر ثانی کا معمول رکھا گیا ہے ، نظر ثانی کے دوران کہیں الفاظ میں تبدیلی کی ضرورت پیش آتی تو بہت ہی موزوں الفاظ کی نشاندہی کرتے ، سیمینار کے اختتام پر جو اجلاس عام ہوتا ہے ، اس میں بھی یقینی طور پر آپ کا خطاب شامل ہوتا ، جسے سامعین شوق کے ساتھ سنتے اور جس میں ملت کے لئے ضرور کوئی اہم پیغام ہوتا۔

قاضی صاحب کی وفات کے بعد ملی کونسل کی تشکیل نو ہوئی ، اس میں بھی آپ کے نہ چاہنے کے باوجود آپ کو نائب صدر بنایا گیا ، یہاں بھی آپ کی رائے گویا فیصلہ کن ہوتی ؛ چوں کہ قاضی صاحب کو ملی کونسل کے قیام کے بعد زیادہ وقت نہیں ملا ؛ اس لئے زیادہ تر ریاستوں میں اس کی بنیاد مضبوط نہیں ہوسکی ؛ لیکن کرناٹک میں آپ کی توجہ سے ملی کونسل ہمیشہ متحرک رہی ، خدا کرے آئندہ بھی یہی صورتِ حال باقی رہے ، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے آپ رکن تاسیسی بھی تھے اور رکن عاملہ بھی ، آپ اس کی نشستوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے اور شروع سے اس کارواں میں شریک تھے ، آپ کی اصابت رائے کے سبھی لوگ قائل تھے ، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ، حضرت مولانا علی میاںؒ ، حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ ، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ ، حضرت مولانا سید نظام الدین صاحبؒ اور حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ ، یہ سبھی بزرگ آپ کے بے حد قدرداں تھے ، ہر اہم مسئلہ میں آپ کے مشورہ کے طلب گار ہوتے تھے اور آپ کی رائے کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔

دینی مدارس سے آپ کو خصوصی تعلق تھا ؛ چنانچہ آپ جنوبی ہند کی کئی دینی جامعات کے سرپرست تھے ، جہاں نظم ونسق کے تمام اُمور آپ کے مشورہ سے انجام دیئے جاتے تھے ، اس کے علاوہ آپ دارالعلوم وقف دیوبند اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین تھے ، آپ کی رائے گہرے غور وفکر پر مبنی ہوتی تھی اور اربابِ انتظام اسے سرآنکھوں پر رکھتے تھے ، المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد سے بھی آپ کو خصوصی تعلق تھا ، جس وقت اس کا قیام عمل میں آیا ، اس وقت بھی آپ کی تقویت وتائید ادارہ کے خدام کو حاصل تھی ، راقم الحروف کی گذارش پر آپ نے معہد کی سرپرستی بھی قبول فرمائی ، اس کے متعدد سالانہ جلسوں کی صدارت فرمائی ، معہد میں ۲۰۱۱ء میں قرآن مجید پر اور ۲۰۱۶ء میں سیرت نبوی پر 'بین الاقوامی کانفرنس' منعقد ہوئی ، دونوں پروگراموں میں آپ کی شرکت ہوئی اور سیرت سیمینار کے اجلاس عام میں تو آپ ہی نے صدارت فرمائی ، معہد میں شروع سے سبیل الرشاد کے طلبہ داخلہ لیتے رہے ، جو طلباء داخلہ لینے کے بعد آپ سے ملاقات کرتے ، آپ ان کی حوصلہ افزائی فرماتے اور کہتے : تم اچھی جگہ پر گئے ہو۔

اس حقیر پر بھی مفتی صاحب کی خصوصی عنایت تھی، مئی ۲۰۱۷ء میں جامعہ عائشہ کا سالانہ اجلاس ہوا، جس میں بخاری شریف کی آخری حدیث کا درس بھی ہوتا ہے، اس درس کے لئے مفتی صاحب کا نام طئے پایا، ادارہ کے سرپرست کی حیثیت سے راقم نے فون پر مفتی صاحب سے درخواست کی اور جامعہ کے نمائندے بھی حاضر خدمت ہوئے؛ حالاں کہ ناسازیٔ طبیعت کی وجہ سے اس وقت پروگراموں میں شرکت سے معذرت کر رہے تھے؛ لیکن اس درخواست کو قبول فرمالیا، بورڈ کا اجلاس ہو یا اکیڈمی کا سیمینار، یا کوئی اور پروگرام، ہمیشہ اس حقیر کی حوصلہ افزائی کرتے، عام طور پر کتابوں پر مقدمہ یا تقریظ لکھنے کا معمول نہیں تھا؛ لیکن اُصولِ حدیث پر اس حقیر نے ایک مختصر سا رسالہ مرتب کیا اور آپ سے تقریظ لکھنے کی گذارش کی، سفر میں ہونے کے باوجود برجستہ تقریظ تحریر فرمائی اور اس حقیر کے بارے میں حسب ذیل کلمات لکھے :

> حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم ملک کے مشہور اور ممتاز عالم دین ہیں ...... اہل زبان بھی ہیں اور صاحب قلم بھی ، اللہ تبارک تعالیٰ نے آپ کو جوہرِ خطابت بھی عطا فرمایا ہے اور ملکۂ تحریر سے بھی نوازا ہے، آپ کی تقریریں شیریں بیانی کا عمدہ نمونہ اور آپ کی نگارشات شگفتہ نویسی کا شاہکار ہیں ، متعدد علمی دینی کتابوں کے مصنف ہیں، جو اپنے معیار کی بنا پر قبولیت عامہ کا درجہ حاصل کر چکی ہیں، زیر نظر رسالہ مولانائے موصوف نے اُصول حدیث میں تحریر فرمایا ہے، جو اس اہم موضوع کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے اور مشکلات فن کی نہایت چابک دستی کے ساتھ گرہ کشائی کرتا ہے۔

مفتی صاحب سے آخری ملاقات کلکتہ اجلاس آل انڈیا مسلم پرسنل بورڈ منعقدہ: نومبر ۲۰۱۶ء میں ہوئی، یوں تو ان کی صحت میں ادھر کئی سالوں سے انحطاط تھا؛ لیکن اس بار پاؤں پر خاصا ورم تھا اور صحت میں زیادہ گراوٹ تھی، پھر مؤرخہ: ۹/اگست ۲۰۱۷ء کو دہلی میں قومی یکجہتی کے موضوع پر ملی کونسل کے زیر اہتمام پروگرام منعقد ہوا، اس میں مفتی صاحب کو بھی شرکت کرنی تھی ؛ لیکن علالت کی وجہ سے آخر وقت میں ان کا سفر ملتوی ہوگیا ، اس سال (۱۴۳۹ھ) اللہ تعالیٰ نے اس حقیر کو حج کی سعادت نصیب فرمائی، ہمارا قافلہ حج سے فارغ ہو کر مکہ مکرمہ واپس آیا تو دوسرے تیسرے دن واٹس ایپ پر اطلاع ملی کہ مفتی صاحب سخت علیل ہیں اور ہسپتال میں خصوصی نگہداشت والے شعبے میں داخل کئے گئے ہیں، عزیزی مولانا محمد رفیع الدین رشادی سلمہ اللہ تعالیٰ —— جو ہمارے گروپ میں اصلاحی بیانات منظم کرنے کے ذمہ دار تھے —— سے میں نے کہا کہ مفتی صاحب کے لئے دُعائے صحت کی اپیل

کریں، اس کے دودنوں بعد ہی مؤرخہ: ۷ رستمبر ۲۰۱۷ءکواطلاع ملی کہ مفتی صاحب کی وفات ہوگئی، اس اطلاع سے جتنا رنج ہوا، اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا، ایسا محسوس ہوا کہ کسی قریب ترین خاندانی بزرگ نے داغ فراق دے دیا ہو، بہرحال حرم شریف کی حاضری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے خوب دُعا بھی کی اور طواف کی سعادت بھی حاصل کی۔

مفتی صاحب کی مقبولیت ومحبوبیت کا اندازہ تو ان کی زندگی میں بھی تھا، وہ اپنے بڑوں کے بھی محبوب تھے اور چھوٹوں کے بھی؛ لیکن ان کی وفات کے بعد یہ تاثر اور بڑھ گیا، مفتی صاحب کے دیدار کے لئے دوکلومیٹر سے زائد لمبی لائن لگی ہوئی تھی اور بالآخر منتظمین کو اسے روک دینا پڑا، کیا عوام اور کیا خواص، کیا مسلمان اور کیا غیر مسلم، علماء ومذہبی قائدین اور سیاسی وسرکاری شخصیتوں کا نہ تھمنے والا سیلاب تھا، جو آرہا تھا، حکومت کرناٹک کی طرف سے گارڈ آف آنر بھی پیش کیا گیا اور بہت بڑے مجمع نے نم آنکھوں کے ساتھ آپ کو سپرد خاک کیا، اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائیں اور آپ کی خدمات کا شایانِ شان اجرعطا فرمایا جائے۔آمین

فارسی کا مصرع ''رفتید ولے نہ از دلِ ما'' بہت سے گذرنے والے کے لئے لکھا جاتا ہے اور یہ وفیات کا ایک رسمی عنوان بن گیا ہے؛ لیکن آج میں واقعی قلبی جذبات کے ساتھ اس مصرع کو عنوان کا حصہ بنا رہا ہوں؛ کیوں کہ مفتی صاحب دنیا سے رُخصت ہوگئے اور ہر آنے والے کو رُخصت ہونا ہے؛ لیکن آپ کی شخصیت ایسی تھی جو دل کے نہاں خانہ سے رُخصت نہیں ہوسکتی، جن کی یاد ہمیشہ تر وتازہ رہے گی اور جن کا نقش محبت ہمیشہ لوحِ دل پر ثبت رہے گا۔

● ● ●

چند دن وینکُور (کناڈا) میں!

خالدسیف اللہ رحمانی

براعظم امریکہ کا ایک اہم ملک کناڈا ہے، جس کی سرحدیں امریکہ سے ملی ہوئی ہیں، اس حقیر کو پہلی بار کناڈا کے اسلامک فاؤنڈیشن کی دعوت پر ۲۰۱۱ء میں حاضری کا موقع ملا تھا، ادھر ایک سال سے وہاں کے ایک مخلص دوست جناب اسلم دھارا صاحب —— جو برصغیر کے مختلف علماء کے میزبان رہ چکے ہیں —— نے کناڈا کے سفر کے لئے رابطہ کر رکھا تھا؛ لیکن یہاں کی مشغولیات کی وجہ سے اس کا موقع نہیں مل سکا، بالآخر انھوں نے ہندوستان میں اپنے نمائندہ کے ذریعہ ویزا بھی نکلوا دیا، پھر بھی تاخیر ہوتی رہی، اور اندیشہ تھا کہ ویزا کی مدت ختم ہوجائے، تب بالآخر مجھے ان کی دعوت پر لبیک کہنے کے سوا چارہ نہیں رہا؛ لیکن اب سفر کے لئے جس مہینہ میں جانا پڑ رہا تھا، وہ تھا فروری کا مہینہ، جو اُن ملکوں میں برف باری کا زمانہ ہوتا ہے، اور میری صحت کا حال یہ ہے کہ ٹھنڈک ذرا بھی برداشت نہیں ہوتی؛ اس لئے سفر کرنے میں تأمل تھا؛ لیکن جناب اسلم دھارا صاحب نے بتایا کہ یہاں اس موسم میں سارا کاروبارِ زندگی جاری رہتا ہے، مسجدوں، گھروں اور عمارتوں کے اندر برف باری کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے؛ چنانچہ اللہ اللہ کرکے سفر کا ارادہ کیا، اور ۸؍فروری ۲۰۱۷ء کو حیدرآباد سے اور ۹؍فروری کو دہلی سے عشاء کے بعد کناڈا ائیر لائنس کے ذریعہ ٹورنٹو کے لئے روانہ ہوگیا؛ حالاں کہ یہ سفر ۱۴؍گھنٹے کا تھا؛ لیکن وقت کے فرق کی وجہ سے جب میں ٹورنٹو پہنچا تو صبح طلوع ہو رہی تھی، ائیر پورٹ سے باہر نکلنے کے بعد بیرونی حصہ میں نماز ادا کی گئی، ایک غیر مسلم ملک میں حکومت کی طرف سے مسلمان مسافروں کے لئے نماز گاہ کا انتظام ایک قابل تعجب بات معلوم ہوتی ہے، خود ہندوستان میں بھی مختلف ائیر پورٹوں پر اس کا انتظام ہے؛ لیکن اس میں مسلمانوں کے لئے ایک سبق ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ کے کسی حکم پر عمل کرتا ہے تو اللہ اس کے لئے اس عمل کو آسان کردیتے ہیں۔

ائیر پورٹ پر مختلف حضرات استقبال کے لئے موجود تھے، جناب اسلم صاحب، جناب محمد اشرف صاحب، جناب محمد صاحب اور بعض دیگر حضرات، یہ حضرات مجھے ائیر پورٹ سے سیدھے کیمبرج شہر لے گئے، ۹؍فروری کی

صبح سے ۱۰ر کی صبح تک یہاں تمام سہولتوں سے آراستہ ایک مکان میں ٹھہرایا گیا، اور استراحت کا خیال کرتے ہوئے سوائے انفرادی ملاقاتوں کے کوئی پروگرام نہیں رکھا گیا، ۱۰رفروری کو ہم ٹورنٹو کے لئے روانہ ہوئے، نماز جمعہ سے پہلے اسلامک فاؤنڈیشن کی وسیع وخوبصورت مسجد میں خطاب ہوا، یہاں مسجد کے دوسرے ذمہ داران کے ساتھ ساتھ میرے قدیم رفیق اور مخلص دوست حضرت مولانا عبداللہ شاہ محدث دکن کے نواسے جناب شاہ محمد قادری صاحب خصوصی طور پر حسبِ سابق مہربان رہے، یہاں ۱۴رفروری تک میرا قیام رہا، اس درمیان مختلف دینی مراکز پر کچھ عرض کرنے کا موقع ملا، جن میں سب سے اہم پروگرام علماء کا دوروزہ ورکشاپ تھا، جو مسجد ابوبکر صدیقؓ میں رکھا گیا تھا، صبح اور شام میں ساٹھ ستر علماء شریک ہوئے، اس پروگرام میں اجتہاد، اختلاف اور ادبِ اختلاف، فقہ الاقلیات — عصر حاضر کے پس منظر میں، نیز تجارت اور علاج سے متعلق موضوعات پر گفتگو کی گئی، مولانا محمد قاسم انگار صاحب اس ورکشاپ کے نگراں تھے، جو مخلص اور صاحبِ بصیرت آدمی ہیں، اور گجرات کے مشہور عالم دین حضرت مولانا مفتی عبداللہ کاپودروی کے عزیز ہیں، یہاں ۱۰ تا ۱۳رفروری کو شدید برف باری ہوئی، کیمبرج اور ٹورنٹو دونوں شہروں میں میدان اور کھلی جگہیں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں، ایسا لگتا تھا کہ کسی نے چاند سے چاندنی مستعار لے کر زمین پر بچھادی ہو، سڑکوں پر برف صاف کر کے جب راستہ بنایا گیا تو دونوں طرف برف کی کئی کئی فٹ بلند دیوار کھڑی ہوگئیں۔

اس سفر کے ایک محرک معہد کے فاضل عزیز مکرم مولانا شجاعت علی ندوی سلمہ اللہ تعالیٰ تھے، جو کناڈا کے مشہور شہر وینکوور میں مقیم ہیں، اور اہم خدمت انجام دے رہے ہیں، لوگوں پر ان کے اچھے اثرات ہیں، اس سفر کے داعیوں میں وہ بھی شریک تھے؛ چنانچہ ۱۵رفروری کو ہم ائیر کناڈا کے ذریعہ ۲ر بجے دن ٹورنٹو سے روانہ ہوئے، ہم لوگ ہوائی جہاز سے مکمل پانچ گھنٹے کا سفر طے کر کے سرشام وینکوور پہنچے، یہ شہر امریکہ کی سرحد پر واقع ہے؛ چنانچہ ہم لوگ اپنے میزبانوں کے ساتھ ایک دن امریکہ کی سرحد تک گئے؛ بلکہ کچھ حصہ تو دونوں ملکوں کے درمیان مشترک ہے، چہل قدمی کی، مولانا شجاعت صاحب نے ۱۶رفروری استراحت کے لئے رکھا، ۱۷رفروری کو نماز جمعہ سے پہلے ''مسجد نور'' جو سری نامی محلہ میں واقع ہے، میں خطاب کرنے کا موقع ملا، اسی مسجد کے تحتانی ہال میں بعد مغرب اور اگلے دن ہفتہ کو صبح ۹ر بجے سے علماء کے ساتھ نشست ہوئی، اِن مجلسوں میں بھی اختصار کے ساتھ حاضرین کے حسبِ خواہش ان ہی مسائل پر گفتگو ہوئی، جن پر ٹورنٹو میں علماء کے درمیان گفتگو کی گئی تھی، اس علاقہ میں علماء کی تعداد کم ہے؛ اس لئے مجلس میں شریک ہونے والوں کی تعداد ۱۴ر ۱۵ر سے زیادہ نہیں تھی،

یہ مختلف مساجد کے ائمہ اور دینی درسگاہوں کے ذمہ دار تھے، ۱۷ر فروری کو عشاء کے بعد وینکُور کے تبلیغی اجتماع جامع مسجد سری میں خطاب ہوا، اس مسجد میں قاری عبدالوہاب صاحب امام ہیں، جو بڑی خوش آوازی سے قرآن مجید پڑھتے ہیں، یہاں چوں کہ ہفتہ اور اتوار کو چھٹی ہوتی ہے؛ اس لئے جمعہ کے بعد کی شب میں ہی تبلیغی اجتماعات ہوتے ہیں۔

۱۸ر فروری کو مسجد نور ہی میں بعد نماز عشاء عوامی خطاب رکھا گیا، جس میں شرکاء کی بڑی تعداد تھی، خطاب کے بعد لوگوں نے بہت سارے سوالات بھی کئے۔

۱۹ر فروری اتوار کو مولانا شجاعت صاحب نے صبح میں تفریح کا پروگرام رکھا تھا، فاضل عزیز جناب مولانا احمد عبدالمجیب قاسمی ندوی سلمہ اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ وہ میری محبت میں امریکہ سے وینکُور آ گئے، اور تین دنوں ساتھ رہے، ان کی آمد نے سفر کے لطف کو دوبالا کر دیا، اور بہت اچھی طرح وقت گذرا؛ چنانچہ مولانا شجاعت علی ندوی کے ساتھ مولانا احمد عبدالمجیب صاحب، جناب احمد لہری صاحب اور یہ حقیر Squamish کے لئے روانہ ہوئے، جہاں تانبے کی کانیں ہیں، اور جہاں اس کی صفائی کر کے اس کو الگ کیا جاتا ہے، ہم لوگوں نے تفصیل سے اس کو دیکھا، ہمارے ملک میں جہاں معدنیات نکالی جاتی ہیں، اور جہاں ان کی صفائی کی جاتی ہے، وہاں بہت زیادہ گندگی، کیچڑ اور گرد وغبار ہوتا ہے؛ لیکن یہاں کی انتظامیہ نے اس کو بہت صاف ستھرا رکھا ہے، اس جگہ سے کافی چڑھائی کے بعد بلندی پر ''مائنس ماؤنٹین'' نامی جگہ ہے، جو سطح سمندر سے کافی بلندی پر ہے، یہاں مسلسل برف باری ہو رہی تھی، زمین، درخت، پہاڑ سب برف کی دبیز چادریں اوڑھے ہوئے تھے، اور برف اس طرح گر رہی تھی، گویا زمین پر روئی کے گالے پھینکے جا رہے ہوں، یہ ہمارے لئے بالکل نیا منظر تھا، جس کے بارے میں اخبارات اور کتابوں میں تو پڑھا تھا؛ لیکن کبھی دیکھا نہیں تھا؛ اس لئے خواب وخیال کی باتیں معلوم ہوتی تھیں، بہر حال اونچے نیچے راستوں سے گذرتے ہوئے مولانا شجاعت علی ندوی کی مسجد ''مسجد الحق'' پہنچے، بعد مغرب یہاں خطاب تھا، لوگوں کی اچھی تعداد تھی، مولانا شجاعت علی ندوی سلمہ چاہتے تھے کہ ''خاندانی نظام کی اہمیت اور اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات'' کے عنوان پر بات کی جائے؛ چنانچہ اس موضوع پر کچھ عرض کیا گیا، لوگوں نے بڑی توجہ سے سنا اور تأثر کا اظہار کیا؛ چوں کہ مغربی معاشرہ میں خاندان بکھر رہا ہے، اور لوگ اس کی وجہ سے بہت پریشان ہیں؛ اس لئے ان کے یہاں یہ موضوع بڑا اہم ہے۔

۲۰-۲۱ر فروری کی تاریخیں میزبانوں نے شہر کے قابل دید مقامات کے لئے رکھے تھے؛ چنانچہ ۲۰ر کی صبح

ہم لوگ نکلے، اور صوبہ کی راجدھانی ''وکٹوریہ'' پہنچے؛ چوں کہ یہ علاقہ ایک زمانہ میں برطانیہ کے زیر قبضہ تھا؛ اس لئے اس شہر کا نام ملکہ وکٹوریہ کے نام پر رکھا گیا، یہ شہر اپنی عمارتوں کے لحاظ سے ایسا لگتا ہے کہ انگلینڈ کا ایک حصہ ہے، اسی شہر میں اِس ریاست کی اسمبلی کی بہت بڑی عمارت بھی ہے، یہ عمارت ہندوستان کی پارلیمنٹ کی عمارت سے کافی مشابہت رکھتی ہے اور برطانوی ذوق تصور کا شاہکار ہے؛ لیکن ہمارے یہاں چھوٹے چھوٹے ادارہ کے لئے جو سخت اور پیچیدہ سیکوریٹی ہوتی ہے، یہاں اس کے مقابلہ نہایت آسان اور معمولی انتظام تھا؛ چنانچہ ہم لوگوں نے باہر سے بھی اسمبلی کی عمارت کا مشاہدہ کیا، اس کے چاروں طرف موجود پارک دیکھے اور عمارت کے اندر بھی جانے کا موقع ملا، اس وقت اسمبلی کی کارروائی جاری تھی؛ اس لئے اسمبلی کے مباحث سننے کا بھی موقع ملا، یہاں مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں، اور ان میں اچھی خاصی تعداد مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی ہے؛ اس لئے اسمبلی میں بھی ہندوستان اور پاکستان نژاد حضرات اور سکھوں کے نمائندے شامل تھے، اور غالباً اس وقت ایک سکھ ہی چیف منسٹر کے عہدہ پر فائز تھے، یہاں سے ہم لوگ برٹش کولمبیا گئے، یہ بھی ایک چھوٹا؛ لیکن خوبصورت شہر ہے، اور برطانوی طرز تعمیر کا واضح نمونہ ہے، یہ پورا دن؛ بلکہ رات کا ایک تہائی بھی اسی سیر میں گزر گیا۔

۲۱ رفروری ہمارے قیام کا آخری دن تھا اور آج کا دن بھی میزبان نے تفریح کے لئے رکھا تھا؛ چنانچہ مختلف مقامات پر احباب کے ساتھ لے جایا گیا، جھولتا ہوا برج دیکھنے کو ملا، جو ایک ندی کے اوپر واقع ہے، جس کو "Suspension Bridge" برج کہا جاتا ہے، لائنس گیٹ جانے کا بھی اتفاق ہوا، جس کو دنیا کا سب سے اونچا برج قرار دیا جاتا ہے، ایک اور برج بھی لے جایا گیا، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ چوڑائی کے اعتبار سے دنیا کا سب سے چوڑا برج ہے، ایک قدیم ٹاور سے گزرنے کی نوبت آئی، جہاں سے مسلسل بھاپ اُٹھتی رہتی ہے، اور اسی سے ٹاور پر لگی ہوئی گھڑی چلتی ہے، یہ شہر سمندر کے ساحل پر واقع ہے، یہاں ''اسٹین لیولی پارک'' بنا ہوا ہے، جو بہت بڑا اور نہایت خوبصورت پارک ہے، یہاں ایک طرف سمندر کی مچلتی ہوئی لہریں اور دوسری طرف ہرا بھرا پارک بیحد خوبصورت منظر پیش کرتا ہے، اس سیر وسیاحت سے فارغ ہونے کے بعد میں اپنی منزل پر پہنچ گیا، اور ائیر پورٹ کے لئے روانہ ہوگیا۔

وینکوور کو کناڈا کا بہت خوبصورت شہر مانا جاتا ہے، اور واقعی یہ بہت خوبصورت شہر ہے، برف پوش پہاڑی چوٹیاں، ہرے بھرے درخت اور جنگلات کی کثرت، اس کے پہلو بہ پہلو سمندر کی مچلتی ہوئی لہریں، صاف شفاف کشادہ سڑکیں، رم جھم موسم، فضا میں بار بار لہراتے ہوئے بادلوں کی آمد ورفت، بیچ بیچ میں سنہری دھوپ اور اس کی

خوشگوار حرارت، یہ سب چیزیں ایک سیاح کے لئے بشاشت نظر کا اور ایک صاحب ایمان کے لئے خدا کی قدرت پر یقین میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔

کناڈا کے اس سفر میں جو چند تأثرات ذہن پر نقش ہوئے، ان کا تذکرہ ضروری محسوس ہوتا ہے، اور یہی حاصل سفر ہے :

اول یہ کہ قومی اور اجتماعی سطح پر تو مغرب اخلاقی اقدار سے محروم ہے؛ کیوں کہ اس وقت دنیا بھر میں جو خون ریزی ہو رہی ہے، اس کا سبب اہل مغرب ہی ہیں، جو اپنے ہتھیار بیچ بیچ کر ایشیا اور افریقہ میں نئے نئے مقتل سجا رہے ہیں؛ لیکن انفرادی سطح پر وہاں لوگ واقعی اسلامی اخلاق کا نمونہ نظر آتے ہیں، جھوٹ بولنے سے بچتے ہیں، دھوکہ دینے کو بہت برا سمجھتے ہیں، بوڑھوں کا ادب کرتے ہیں، عورتوں کا پاس رکھتے ہیں، پیدل چلنے والوں کا لحاظ کرتے ہوئے گاڑی چلاتے ہیں، قانون کا احترام کرتے ہیں، راستہ چلتے ہوئے کوئی دوسرے کے ٹریک میں داخل نہیں ہوتا، قطار میں لگتے ہوئے کوئی شخص اپنے آگے والوں سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتا، سامان بیچتے ہوئے عیب نہیں چھپایا جاتا، خریدار اگر بہت سارا سامان دیکھے تو تاجر کی پیشانی پر شکن نہیں آتی، چاہے اس نے کتنی ہی سامان دکھائے ہوں، خریدار مقررہ ضابطہ کے مطابق اپنا سامان واپس کرنا چاہے تو بخوشی واپس لے لیتے ہیں، دفتر ہو، گھر ہو، یا کوئی پروگرام یا میٹنگ وقت کی پابندی کی جاتی ہے، مقرر بھی اپنے آپ کو وقت کا پابند رکھتا ہے، ہر شخص خندہ پیشانی سے ملتا ہے، ایمیگریشن میں مسافروں کی مدد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ایمیگریشن کے مرحلہ پر خاص کر خلیجی ملکوں اور بالخصوص سعودی عرب کی یاد آتی ہے، جہاں ایسا لگتا ہے کہ وہ ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کو انسان نہیں سمجھتے۔

یہی وہ اخلاقی اوصاف ہیں، جن کی بدولت مغرب کو پوری دنیا میں سیاسی، معاشی اور تجارتی برتری حاصل ہے، بقول علامہ اقبال مرحوم :

مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

یہ مسلمانوں کے گھر کی امانت اور ان کے مذہب کی تعلیمات ہیں، جن کو اہل مغرب نے اختیار کیا ہے، ضرورت ہے کہ مسلمان اس میراث کو واپس لیں، اور اپنی اخلاقی سطح کو بلند کریں، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کا عمل بالکل دو متضاد تصویر پیش کرتے ہیں، اور پھر ہمیں شکایت ہوتی ہے کہ مسلمان ہونے کے باوجود ہم کیوں اتنی آزمائشوں میں مبتلا ہیں اور ہم سے کیوں نفرت کی جاتی ہے؟

دوسری خوبی جواُن کے یہاں دیکھنے میں آتی ہے، وہ جمہوری طرز فکر اور اختلاف کو برداشت کرنے کی صلاحیت ہے، مسلم ملکوں کی ایک عجیب بیماری یہ ہے کہ ان کے یہاں جمہوریت اور حریتِ رائے کو برداشت کرنے کی صلاحیت بالکل نہیں ہے، اکثر مسلم ملکوں میں یا تو فوجی ڈکٹیٹر مسلط ہیں، یا بادشاہ سلامت، عوام کو اظہار رائے کی آزادی حاصل نہیں ہے، اور ذرائع ابلاغ حکومت وقت کی تعریف اور خوشامد پر مامور ہیں، بہت ہی باریک بینی کے ساتھ خبروں کو چھانا جاتا ہے، شاید میدے کی چھلنی بھی اتنی باریک نہ ہوتی ہو کہ تنقید کا کوئی کنکر بھی رہ نہ جائے، اس کا نتیجہ ہے کہ حکمراں خوشامدی ٹولے کے درمیان رہتے ہیں، اور کوئی مخلص شخص ان کو مشورہ نہیں دے سکتا۔

مغرب سے اسلامی ملکوں کو جو چیز لینی چاہئے تھی، انھوں نے نہیں لی، اور جس چیز سے بچنا چاہئے تھا، عریانیت، بے حیائی، لہو ولعب کی حوصلہ افزائی، انھیں سرآنکھوں پر رکھا، اور صورت حال یہ ہے کہ آج عرب ملکوں میں جا کر ایسا لگتا ہے کہ ہم یوروپ کے کسی ملک میں آگئے ہیں، کم وبیش یہی حال مسلم اداروں اور تنظیموں کا ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کے اکثر اداروں اور تنظیموں کے ٹکڑے ہورہے ہیں، اس کی بڑی وجہ شورائی نظام کا فقدان ہے؛ کیوں کہ لوگ اختلاف کو مخالفت سمجھنے لگتے ہیں اور تنقید کو تنقیص، اختلاف کرنے والے بھی کچھ اس انداز سے اختلاف کرتے ہیں کہ لگتا ہے کہ وہ عزت ریزی پر کمر بستہ ہیں۔

امریکہ اور کناڈا دونوں کافی بڑے ممالک ہیں، دونوں کا رقبہ بہت وسیع ہے، دونوں زبردست قدرتی وسائل کے مالک ہیں؛ لیکن امریکہ کے مقابلہ کناڈا کی آبادی کافی کم ہے، نیز جدید ٹکنالوجی، سائنسی ترقی اور دفاعی قوت کے اعتبار سے امریکہ بہت آگے ہے، اگر امریکہ کناڈا کے علاقے بزور طاقت حاصل کرنا چاہتا تو اس کے لئے چنداں دشوار نہ تھا؛ لیکن دونوں ممالک امن کے ساتھ اپنی اپنی سرحدوں میں سمٹے ہوئے ہیں، امریکہ نے کبھی اپنی طاقت کا سہارا لے کر کناڈا کو نہ دھمکی دی اور نہ دخل اندازی کی، کاش! مسلم ممالک اس سے سبق لیں، مسلمان ملکوں کو طاقت ہضم ہی نہیں ہوتی، یہاں تک کہ جن کی کوئی طاقت نہیں، اور جنھوں نے اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لئے پہرہ دار رکھ رکھے ہیں، وہ بھی آپس میں ایک دوسرے کو آنکھ دکھاتے ہیں، جس کی بدترین مثال خلیجی ممالک ہیں۔

یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ جو مسلمان مغربی ممالک میں گئے ہیں، وہ وہاں تعمیری ذہن کے ساتھ کام کرتے ہیں، ہندوستان میں ہم تعلیم میں پیچھے ہیں؛ لیکن ہم ہی جب مغربی ممالک میں پہنچتے ہیں تو وہاں تعلیم میں آگے ہیں، منظم ہیں اور فرض شناس کارکن سمجھے جاتے ہیں، اسی طرح باہر کے ملکوں میں غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ عموماً ان کے

تعلقات اچھے ہیں، اور وہ رواداری کا مظاہرہ کرنے میں کسی سے کم نہیں ہیں؛ لیکن عجیب بات ہے کہ خود مسلمانوں کے آپسی تعلقات میں اس رواداری، تحمل اور فریق مخالف کے احترام کی کیفیت نہیں پائی جاتی، جس اُمت کی تصویر ''رحماء بينهم و أشداء على الكفار'' کے الفاظ سے کھینچی گئی ہے، وہ بالکل اس کے برعکس بے گانوں کے لئے تو اپنے پہلو کو نرم رکھتی ہے، اور اپنوں کے لئے شمشیر برہنہ بن جاتی ہے، کاش! کم سے کم ہم اُن لوگوں سے زندگی گزارنے کا سبق سیکھیں، جن سے ہم بے خدا تمدن اور بے حیا تہذیب کا سبق پڑھ رہے ہیں۔

• • •